راستے اور کھڑکیاں
انور خاں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
اشتراک
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

راستے اور کھڑکیاں

(افسانے)

انور خاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

Raste Aur Khidkian
by
Anwar Khan
Rs.68/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025   011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006   011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003   022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002   0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025   011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2013   تعداد: 1100   قیمت: -/68روپے

ISBN :978-81-7587-958-4   سلسلۂ مطبوعات:1740

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر:49539000   فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ ناموافق حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود

مینجنگ ڈائرکٹر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

برادر مکرم جناب محمد خاں صاحب

کی

خدمت میں

ادب اور احترام کے ساتھ

انور خاں

فہرست

کوّوں سے ڈھکا آسماں

آسماں ان گنت سیاہ جھُجنگ کوّوں سے ڈھکا تھا۔ وہ لوگ آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے اطراف میں بلند عمارتیں تھیں۔ جن کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔

"بڑی سردی ہے" ایک نے کہا۔

"اور ہوا بھی ایسی تیز" دوسرے نے کہا۔

"جیسے رام پوری چاقو ہڈیوں میں اُتر رہا ہو" تیسرے نے بات پوری کی۔

"سنتے ہیں دن بھی نکلنے کا نہیں۔" چوتھے آدمی نے کہا۔

"یہ تم سے کس نے کہا" پہلا آدمی پریشان ہو کر بولا۔

"شہر میں ایسی افواہیں ہیں۔" وہ آدمی بولا۔

"مجھے تو بالکل جھوٹ لگتا ہے۔" دوسرا آدمی بولا۔

"بھلا ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟" پہلے آدمی نے کہا۔

"آج تک کبھی ایسا نہ ہوا۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا" تیسرے آدمی نے کہا۔

"آگ دھیمی ہو رہی ہے۔" چوتھا آدمی بولا۔

"ہمارے پاس ابھی اور لکڑیاں ہیں۔"

"اس شہر کی سڑکیں اس قدر صاف ہیں کہیں کاغذ، لکڑی یا کوئی چیز ایسی نہیں ملتی

جسے جلا کر آدمی خود کو گرم رکھ سکے۔"

"یہ آگ رات بھر جل سکے گی؟

"کیا پتہ؟"

"اور ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ رات کتنی لمبی ہے۔"

"رات تو کاٹنی ہی ہو گی۔"

"چاہے رات کتنی ہی لمبی ہو۔"

وہ چپ ہو گئے اور دیر تک چپ رہے۔ آسمان ان گنت کوّوں سے ڈھکا تھا۔ تیز سرد ہوا رام پوری چاقو کی طرح ہڈی میں اُترتی تھی۔ اطراف میں بلند عمارتیں تھیں جن کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔

قدموں کی چاپ سُن کر اُنھوں نے سر اٹھایا۔ ایک دُبلا پتلا کھچڑی سے بالوں والا آدمی اُن کی طرف آ رہا تھا۔ وہ آدمی آگ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم؟ کیا کرتے ہو؟"

"پردیسی ہوں، کہانیاں جمع کرتا ہوں۔" اُس نے نرم دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کہانی"!! ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"پردیسی کوئی کہانی سناؤ کہ رات کٹے۔"

"ہاں کوئی کہانی سناؤ کہ رات کٹے۔"

"میرے پاس کوئی کہانی نہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں شہر کے تقریباً ہر آدمی سے مل چکا ہوں۔"

"کسی کے پاس کوئی کہانی نہیں؟" پہلے آدمی نے پوچھا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے تو یقین نہیں آتا" پہلے آدمی نے کہا۔

"مجھے بھی یقین نہیں آتا" دوسرے آدمی نے کہا۔

"لیکن یہ سچ ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔

"لیکن یہ سچ ہے!" چوتھے آدمی نے کہا۔

"ہاں یہ سچ ہے۔" کہانی جمع کرنے والے نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" پہلے آدمی نے کہا۔

"مجھے بھی یقین نہیں آتا۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

"کسی مکان میں روشنی نظر نہیں آتی۔" چوتھے آدمی نے کہا۔

"ہاں ایک بھی کمرے میں روشنی نہیں۔" دوسرے نے غور سے اپنے اطراف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہر کی بجلی فیل ہو گئی ہے۔" کہانی جمع کرنے والا بولا۔

"بجلی فیل ہو گئی ہے۔" پہلا آدمی آگ میں گرتے گرتے بچا۔

"بجلی فیل ہو گئی ہے؟" دوسرا ہڑبڑایا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ اب صبح نہیں ہو گی۔"

"ہاں میں نے ایسا ہی سنا ہے۔" اس نے کہا۔

"آگ دھیمی ہو رہی ہے۔" پہلا آدمی بولا۔

"اور لکڑیاں جمع کرنی چاہئیں۔"

دوسرا آدمی اُٹھ کر اطراف میں ایسی چیزیں تلاش کرنے لگا جن کو جلایا جا سکے۔ کچھ دیر بعد وہ مایوس ہو کر لوٹ آیا اور آگ کے پاس بیٹھ گیا۔

"سالی اس شہر کی میونسپلٹی اس قدر واہیات ہے۔ سڑک پر ایک تنکا بھی نہیں۔"

"آگ دھیمی ہو رہی ہے۔" کہانی جمع کرنے والا بولا۔

کافی دیر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ جب آگ بہت ہی دھیمی ہو گئی تو پہلے آدمی نے اپنے کپڑے اُتار کر آگ میں جھونک دیئے۔ سب نے اپنے کپڑے آگ میں جھونک دیئے کہانی جمع کرنے والے نے بھی۔

"پتہ نہیں کتنی رات باقی ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔

"کیسے کٹے گی یہ رات۔" چوتھا آدمی بولا۔

"کیوں نہ ہم ہی کہانی بنائیں۔"

"ہا!" سب کے منہ سے نکلا۔ "کتنی مزیدار بات"

"تو پہلے تم ہی شروع کرو۔" پہلا آدمی بولا۔

"گلابی صبح" کہانی جمع کرنے والا کچھ سوچ کر بولا۔

"ہنستا بچہ" پہلے آدمی نے کہا۔

"شرماتی لڑکی" دوسرے آدمی نے کہا۔

"پھونس کا مکان" تیسرے آدمی نے کہا۔

"مٹھی بھر چاول"۔ چوتھے آدمی نے کہا۔

"مچھلی کا شوربہ۔" پہلے آدمی نے کہا۔

"کافی کا پیالہ۔" دوسرا آدمی بولا۔

"روئی کی دُلائی۔" تیسرا آدمی بولا۔

سب ہنس پڑے۔

آسمان ان گنت سیاہ بھجنگ کوّوں سے ڈھکا تھا اور تیز سرد ہوا مام پوری چاقو کی طرح ہڈیوں میں اُترتی تھی۔ اطراف کی بلند عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور وہ دوہرا رہے تھے۔ گلابی صبح، ہنستا بچہ، شرماتی لڑکی، پھونس کا مکان، مٹھی بھر چاول، مچھلی کا شوربہ، کافی کا پیالہ، روئی کی دولائی۔

آسمان دھواں دھواں ہوا اور فضا کوّوں کی کائیں کائیں سے پٹ گئی۔ ملوں کے بھونپو بجے۔ پھر ایک موٹا سا آدمی بنیان اور نیکر پہنے گیلری میں آ کر دانت مانجھتا کھڑا ہو گیا۔ ایک عورت اپنے بکھرے بال سمیٹتی آئی اور ایک ادھوری انگڑائی لیکر لوٹ گئی۔ نوکر چاکر دودھ کی بوتلیں، ڈبل روٹی، مکھن، سبزی ترکاریاں خریدنے نکلے پھر ایک بس سڑک پر سے گزری۔ جس میں چند آدمی بیٹھے تھے کئی مکانوں سے ٹرانسسٹر کی آوازیں آئیں۔ فلمی گیت اور اشتہارات نشر ہونے لگے۔ اس کے بعد کارپوریشن کی گاڑی آئی اور سڑک کے موڑ پر رُک گئی۔ وہاں چند لوگ برہنہ اکڑے پڑے تھے۔ کچھ لوگ گاڑی میں سے اُترے آدمیوں کو اُٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور گاڑی پھر چل پڑی۔

شکستگی

جس گھر میں میں رہتا ہوں اُس میں دو طرف کھڑکیاں ہیں اور کھڑکیوں کے سامنے ہیں مکانات۔ ان مکانوں میں رہنے والوں کو ہمارے گھر کی ایک ایک چیز دکھائی دیتی ہے۔ وہ ہماری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ہمیں۔ یعنی مجھے اور میرے بیوی بچوں کو۔ صرف چار ہی مہینے ہوئے ہیں۔ لیکن اس مختصر مدت ہی میں ہم بیزار سے ہو گئے ہیں۔

لوگ یہاں ہر وقت کھڑکیوں میں ٹنگے نظر آتے ہیں اور ہر شخص متجسس کہ دوسرے گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ جب ہم شروع شروع میں رہنے آئے تھے ہمارے حلق سے پانی کا گھونٹ بھی مشکل سے اُتر پاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سے کام جیسے کپڑے تبدیل کرنا، بالوں میں کنگھی کرنا۔ یوگا ورزشیں۔ یہاں تک کہ اپنی بیوی کے پاس دو منٹ کے لیے بیٹھنا بھی عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ چار مہینے ہو گئے ہیں لیکن اب تک اپنی بیوی کو رات میں بتّی بجھانے کے بعد بھی پیار نہیں کر پاتا۔ ایسا لگتا ہے بے شمار نگاہیں کھڑکیوں کے بند شیشوں کو چیرتے ہوئے اندر آ رہی ہیں۔

آج اتوار ہے۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ بیوی اور بچے تو کھانا کھا کر لیٹ گئے ہیں اور میں ٹائمس ویکلی کی ورق گردانی میں مصروف۔ لیٹتے یا سوتے وقت کئی کھڑکیاں

بند کرنی پڑتی ہیں۔ جس سے کافی اندھیرا ہو جاتا ہے اور حبس بھی۔ میں ویکلی کو دوبارہ تپائی پر رکھ دیتا ہوں۔ دراصل میرا جی، وِودھ بھارتی سے فلمی گانے سُننے کو چاہ رہا ہے۔ لیکن اگر میں ریڈیو بجاؤں، تو دوسروں کے آرام میں خلل ہوگا۔ میں پھر ویکلی اُٹھا لیتا ہوں۔ اب میں بظاہر ویکلی ضرور دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میری نگاہیں جمتی نہیں، اُچٹ اُچٹ جاتی ہیں۔ یہ حبس ناقابل برداشت ہے۔ پھر ویکلی رکھ دیتا ہوں اور کھڑکی کے قریب چلا جاتا ہوں لیکن میرے ہاتھ چٹخنی سے کھیلتے رہ جاتے ہیں۔ میری بیوی لیٹی ہے اور باہر لوگ ٹنگے ہیں اور وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

لوگ کیوں جاننا چاہتے ہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن وہ یقیناً باہر ٹنگے ہیں لہٰ جاننے کے خواہش مند، یہ بڑا عجیب سا جذبہ ہے۔ اور اب تو میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ گھر پر ہی نہیں باہر بھی لوگ مجھے ننگا کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے کسی دوست سے ملتا ہوں۔ کہاں سے آ رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ کیا سوچ رہے ہو؟ کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں جانتا ہوں کہ ایٹی کیٹ (Etiquette) کے خلاف نہ ہو تو وہ مجھ سے یہ بھی پوچھے کہ میں نے صبح ناشتہ کیا کیا تھا اور دوپہر کے کھانے میں کیا کھایا ہے۔ میری جنسی زندگی کیسی ہے؟ اگر بس چلے تو وہ میرے کپڑے اُتار کر ایک ایک عضو کو ٹٹول کر، بلکہ چیر پھاڑ کر دیکھے۔ میری کھوپڑی ہی کھول کر رکھ دے کہ ان میں محبت، نفرت، [illegible]، انتقام، ہمدردی، گناہ کے کون سے جذبات پل رہے ہیں۔ ماضی کی کون سی یادیں ان میں اونگھ رہی ہیں۔ اور مستقبل کی کون سی اُمنگیں پروان چڑھ رہی ہیں۔

لیکن — میں بھی اب محتاط ہو گیا ہوں۔ میں کیوں دوسروں کو اپنی شخصیت ریزہ ریزہ چُننے دوں؟ میں نے اپنی شخصیت کو خول در خول سمیٹ لیا ہے۔ اب مجھ سے کوئی پوچھتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟ میں کہتا ہوں گھر جب کہ مجھے سینما جانا ہوتا ہے۔ آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟ میں کسی جاسوسی ناول کا نام لے دیتا ہوں۔ اگرچہ قاضی سلیم کی نظمیں پڑھ رہا ہوں۔ میری بیوی پوچھتی ہے۔ "آپ کیا کھائیں گے؟" میں کہتا ہوں "گوشت"

حالانکہ سبزی کھانے کو جی چاہ رہا ہوتا ہے۔ آج آپ کون سی پتلون پہنیں گے ؟ وہ سلیٹی دھاریوں والی جبکہ میں گہرے سبز رنگ کی پتلون پہننا چاہتا ہوں۔ مجھ تک کوئی نہیں پہنچتا۔ میرا جسم شیشے کا سہی۔ لیکن آپ جانتے ہیں آج کل ناقابل شکست شیشے بھی تو بلنے لگے ہیں۔ میں لوگوں سے بڑی سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوتا ہوں لیکن اندر ہی اندر مجھے ہنسی آتی رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں اب کسی کے لیے مجھ تک پہنچنا ممکن نہیں رہا۔ اب میں محتاط ہو گیا ہوں۔ آفس ہو یا گھر۔ دوست احباب ہوں یا کسی محفل میں مِل جانے والے ملاقاتی۔ سب مجھ پر حملہ آور ہوتے ہیں اور خراشیں لوٹتے ہیں۔ لوگ آخر مجھے اُلٹ پلٹ کر دیکھنا ہی کیوں چاہتے ہیں۔ ؟

میری بیوی اُٹھ گئی ہے اور چولھے پر چائے کا پانی چڑھا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آئے گی اور مجھے اُدھیڑنا شروع کر دے گی۔ چائے کے ساتھ آپ کچھ کھائیں گے ؟ میں کہوں گا نہیں۔ حالانکہ میں چاہ رہا ہوں کہ چائے کے ساتھ کچھ نمکین بسکٹ بھی ہوں۔ آج آپ باہر جائیں گے ؟ میں کہوں گا نہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد کپڑے تبدیل کر کے گھر کے باہر آجاؤں گا۔

انجانے میں میں نے کھڑکی کھولی ہے اور سامنے ایک لڑکی کھڑکی سے تقریباً آدھا دھڑ لٹکائے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔ لڑکی خوبصورت ہے اور پُر کشش۔ میں پھر کھڑکی کھولنا چاہتا ہوں۔ مگر اب یہ ممکن نہیں۔ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ جاتا ہوں۔

میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ بنیان اور دھاریوں والے پاجامے میں پھنسا بے ڈول جسم، گول گول چہرہ اور اُس پر دھ گنجا سر۔ اسے بھی چھپانا چاہیے۔ مگر یہ ممکن نہیں بہر حال یہ صندوق ہے گوشت پوست کا۔ اس میں بہت سارا کباڑا بھرا پڑا ہے۔ کچھ اچھی کچھ گندی خواہشات، کچھ دل چسپ اور بے رنگ لمحات۔ چند تلخ اور شیریں حادثات، کچھ لاشیں۔ یہ لاشیں کن لوگوں کی ہیں یہ میں بتا نہیں سکتا بلکہ ان کے چہرے اب خود بھی پہچان نہیں سکتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے مجھے اذیت پہنچی ہے۔ اپنے جسموں سمیت یہ

لوگ آپ کو باہر گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن انھیں تو میں نے قتل کر کے اپنے دماغ کی کوٹھری میں ڈال رکھا ہے۔

در اصل میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس گوشت پوست کے صندوق میں اب کچھ بھی تو نہیں۔ میں اندر سے بالکل خالی ہوں۔ جی ہاں بالکل خالی۔ تبھی تو اپنے آپ کو چھپانا چاہتا ہوں۔ پھر یہ عکس کس کا ہے؟ یہ عکس میرا نہیں۔ اسے مٹ جانا چاہیے۔ میں ہاتھ اٹھاتا ہوں۔ اب ایک ٹوٹا ہوا عکس میری آنکھوں میں دیکھ رہا ہے۔ بہر حال عکس مٹتا نہیں۔ میں ہاتھ گرا دیتا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں اب کھڑکیاں کھول دینی چاہییں۔

☆

راستے اور کھڑکیاں

آفس کے ایک ساتھی کی مدد سے کمرہ مل ہی گیا۔ میں اُن کے ساتھ کمرے پر پہنچا تو کمرے کے مالک شرما جی موجود نہیں تھے۔ بہرحال کمرے کی چابی میرے ساتھی ان سے پہلے ہی لے چکے تھے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ کمرے میں بیٹھ کر اُن کا انتظار کریں۔ ہم نے کمرہ کھول لیا۔ کمرہ کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لیکن شرما جی کا سامان بھی مختصر ہی تھا۔ ایک تپائی، دو کرسیاں اور ایک چھوٹا سا کپ بورڈ۔ میں بستر اور سوٹ کیس ساتھ لایا تھا۔ وہ ایک طرف میں نے رکھ دیا اور کرسیوں پر بیٹھ کر میں اور میرے ساتھی ان کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے شرما جی کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ اسے بھی میں نے غنیمت سمجھا۔ ورنہ کمرے کی پگڑی کا ڈیڑھ دو ہزار روپے ادا کرنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔ میرے دوست کو کہیں جانا تھا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ اس کمرے کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ دیواروں کو پھر سے رنگ و روغن کیا جانا چاہئے۔ کہیں کہیں سے پلاستر اُکھڑ گیا ہے۔ اسے دوبارہ ٹھیک کیا جانا چاہیے۔ ایک دو اچھی تصویریں بھی ان خالی دیواروں میں لگانی ہوں گی تاکہ کچھ Aesthetic touch پیدا ہو سکے۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مکان سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا۔ پھر مکانوں کا سلسلہ ہی سلسلہ تھا۔ کمرہ سڑک

کمرے کے پیچھے کی طرف تھا۔ اس لیے راستے کا شور نہیں پہنچتا تھا۔

"آپ ہی نئے کرایہ دار ہیں؟"

کوئی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ میں پلٹا۔ بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے جو کئی جگہ سے رفو کیا گیا تھا۔ ایک نحیف بوڑھا مجھ سے مخاطب تھا۔

"جی ہاں میں ہی یہاں کا نیا کرایہ دار ہوں۔ شاید آپ اس کمرے کے مالک ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں مجھے راجیشور شرما کہتے ہیں۔"

"ناچیز کو مسعود کہتے ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" کہتے ہوئے ہم دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔

"میری صحت تو ٹھیک ہے نا" کچھ لمحے خاموش رہ کر انھوں نے کہا۔

میں نے تعجب سے ان کو دیکھا۔ اور پھر یوں ہی "ہاں" کہہ دیا۔

"دیکھو دن بھر میں گھر سے باہر نہیں نکلا اور اب آدھ پون گھنٹے کے لیے باہر نکلا تو بارش ہونے لگی۔" شرما جی نے پھر گفتگو شروع کی۔

"بھگوان کو ایک بوڑھے آدمی کو اتنی تکلیف نہ دینی چاہیے۔"

میں مسکرا کر خاموش رہا۔

"آپ پڑھ رہے ہیں ابھی تک یا ملازمت کر رہے ہیں۔؟"

"جی میں ملازمت کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے ماں باپ شاید وطن میں ہیں؟" انھوں نے پھر مجھ سے پوچھا۔

"ہاں" ۔ میں نے مختصر جواب دیا۔

"اب دیکھو اس دنیا میں میرا صرف ایک بھائی ہے۔ وہ میرا ذرا بھی خیال نہیں رکھتا۔ اگر میں مر جاؤں تو وہ اور اس کی بیوی سوچیں گے کہ چلو ایک بلا ٹلی" انھوں نے تلخی سے کہا۔

مجھے اُن پر رحم آنے لگا۔

"وہ آپ سے ملنے کے لیے نہیں آتے؟" میں نے پوچھا۔

کبھی مہینے میں ایک آدھ بار ملنے کے لیے آجاتا ہے اور گذارے کے لیے پیسے دے جاتا ہے لیکن صرف یہی تو کافی نہیں۔

"میری صحت تو ٹھیک ہے نا۔"

"جی ہاں۔"

"میری عمر کے آدمی کے لیے زندگی عذاب ہوجاتی ہے۔" انھوں نے بات آگے بڑھائی۔ "اب دیکھو ہوٹل کے بیرے بھی مجھ سے سیدھی طرح بات نہیں کرتے۔ ابھی دوپہر میں بیرا جلا ہوا توس لے آیا۔ میں نے اُس سے کہا یہ توسٹ جلا ہوا ہے تو کہنے لگا تم بوڑھا ہمیشہ یونہی کھٹ کھٹ کرتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ یہ بات کرنے کا ڈھنگ ہے؟ بھلا ایک بیرا اس طرح بات کرے! میں بوڑھا ہوں اس لیے سب مجھ کو تکلیف دیتے ہیں۔ تم تو ہر چیز کھاتے ہو گے؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ اب میں بور ہونے لگا تھا۔

"ہاں تم جوان ہو۔ جب میں جوان تھا، اتنا کھایا کرتا تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن اب میں بوڑھا ہو گیا۔ ہاضمہ ٹھیک نہیں رہتا۔"

بارش رُک گئی تھی۔ میں شرما جی سے اجازت لے کر چلا دیا۔

گھر والوں سے دُور رہنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کوئی دوست نہ ہونے کی وجہ سے اتنا بڑا شہر ہونے کے باوجود میرا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ آفس میں تو تھوڑی بہت بات چیت، گپ شپ ہو بھی جاتی تھی۔ لیکن آفس کے لوگوں سے میل جول اتنا نہیں تھا کہ آفس کے اوقات کے علاوہ ان سے ملاقات ہوتی۔ شروع شروع میں سوچا تھا۔ چلو شرما جی بوڑھے سہی لیکن کم از کم وقت گزاری کے لیے بُرے نہیں۔ لیکن شرما جی کو میری بڑی فکر تھی۔ ان کا بار بار مداخلت کرنا مجھے کھلنے لگا۔ "یہ قمیص اس پتلون کے ساتھ نہیں پہننی چاہیے۔ تمہارے جوتوں پر پالش کیوں نہیں ہے۔

تم کو رات میں جلدی گھر واپس آجانا چاہیے۔" اس طرح کے جملے سُن سُن کر میں بیزار ہو گیا۔ پہلی بار گھر والوں سے دور رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں کوئی بات بات پر ٹوکنے والا نہیں کہ شرما جی میرے سرپرست بن بیٹھے۔ بار بار اپنی صحت اور خیالی شکایتوں کا ذکر کر کر کے وہ مجھے اور بھی بور کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں یہ عالم ہو گیا کہ میں رات میں صرف سونے کے لیے آتا اور زیادہ سے زیادہ وقت پارکوں اور ریستورانوں اور راستہ ناپنے میں گزارتا۔ پھر بھی صبح اور رات کو سونے سے پہلے شرما جی کو برداشت کرنا ہی پڑتا۔ وہ رات میں دیر تک انتظار کرتے رہتے۔ ویسے بھی بوڑھے تھے، نیند کم ہی آتی تھی۔ تنگ آکر میں ان کی باتوں کو سُن کر ان سُنی کرنے لگا یا مختصر جواب دینے لگا۔ اس کا اثر میرے خاطر خواہ ہوا۔ کچھ دنوں تک انھوں نے میرے رویّے کو برداشت کیا۔ لیکن ایک دن آخر کار پھوٹ پڑے۔ میں آفس جانے کے لیے کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ شرما جی نے گفتگو شروع کی۔

"مسعود صاحب میری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں خاموش رہا۔

"میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔" انھوں نے بات آگے بڑھائی۔ "میرے بھائی کو دیکھو اُسے میری ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ میں چاہے مروں یا جیوں۔ ایک سو بچاس روپے کیا دیتا ہے گویا احسان کر دیا۔ کوئی میرا خیال رکھنے والا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، میری صحت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں خاموش رہا۔ شرما جی کا چہرہ پھیکا پڑتا گیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر جھٹکے سے اُٹھے اور جانے لگے۔ جاتے جاتے وہ رُکے۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن انتہائی دُکھ کی وجہ سے شاید کہہ نہیں پا رہے تھے ——— آخر جیسے اپنی تمام قوت کو جمع کر کے بولے "مسعود صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ میری باتوں سے آپ بور ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کروں اکیلا آدمی ہوں۔ جی گھبراتا ہے اس لیے کچھ نہ کچھ بکواس کرتا رہتا ہوں۔" اتنا کہہ کے وہ چلے گئے۔

میں بے حد شرمندہ ہوا۔ جی ہاکہ انھیں روک کر اپنے رویّے کی معافی مانگ لوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ چلو جو ہوا ٹھیک ہوا رُک گیا۔ اس روز روز کی مصیبت سے تو جان چھوٹی۔

ہمارے تعلقات بگاڑ کی آخری حد پر تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مسٹر رتناکر کا اضافہ ہوگیا۔ ان کے آنے سے تناؤ کم ہوگیا۔ شرما جی نے ان کو کمرے میں رکھنے سے پہلے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس بارے میں ان کی مزاج پرسی کروں۔ لیکن مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ شرما صاحب کہیں مجھ سے ہی دوسری جگہ بند و بست کرنے کے لیے نہ کہہ دیں۔ رتناکر صاحب کا سامان ایک سوٹ کیس پر محدود تھا اور وہ اپنی کوئی چیز سوائے تولیہ کے باہر نہیں رکھتے تھے۔ میں کمرے میں کم ہی ٹھہرتا تھا۔ اکثر رات میں دیر سے آتا۔ اس لیے کمرہ چھوٹا ہونے کے باوجود میں نے اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رتناکر صاحب بھی کافی بوڑھے اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ پنشن پر گزارہ کر رہے تھے۔ شرما جی سے جو تلخ تجربہ ہوا تھا اس کی بنا پر رتناکر صاحب سے میں نے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔

شرما جی میں اور مجھ میں اب سرد جنگ چل رہی تھی۔ عرصے سے ہم دونوں میں ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن شرما جی میں اب وہ بُجھا بُجھا پن نہیں رہا تھا۔ رتناکر صاحب کے آنے سے اُن کو ایک اچھا ساتھی مل گیا تھا۔ اکثر رات میں آتا تو دونوں بوڑھے گھُل مِل کر باتیں کر رہے ہوتے۔ اس وقت میں اپنے دل میں نہ جانے کیوں کچھ حسد سا محسوس کرتا۔ لیکن اب رہائش کے بارے میں مجھے بالکل اطمینان ہوگیا تھا۔

تنہائی میرے لیے سوہانِ روح ہوتی جارہی تھی۔ صبح کو ناشتہ کر کے دیر تک اخبار پڑھتا رہتا۔ یہاں تک کہ اشتہار وغیرہ سب چاٹ جاتا۔ لیکن وقت جیسے رُک سا گیا تھا۔ شام میں دیر تک رسالہ پڑھتا رہتا۔ پھر تھک کر آرام کرتا، خواہ مخواہ کھڑکی کے باہر مکانوں کی قطاریں یا آسمان کو تکتا رہتا۔ اکثر جی چاہتا کہ کسی اپنی ہی عمر کے شخص کے ساتھ خوب باتیں کروں۔ ہنسی مذاق، دھینگا مشتی ہو، گھر کی یاد اب اکثر آتی اور شاید میں لوٹ ہی جاتا۔ لیکن بڑی مصیبتوں سے ملازمت ملی تھی۔

اور گھر والوں کو مجھ سے بڑا سہارا تھا۔

آفس چھوٹنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ دن بھر کا کام ختم کر کے بیٹھا سستا رہا تھا۔ پھر کن حالات نے آگھیرا۔ میں سوچنے لگا، تھوڑی دیر بعد میں آفس سے باہر ہوں گا اور پھر وہی چکر ہوگا۔ میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھروں گا۔ کیوں نہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں لیکن کمرے میں اکیلا پڑا رہنا مجھے اور بھی زیادہ مضحکہ خیز لگا۔ خاص طور سے جب شرما جی کمرے میں موجود ہوں۔ اس سے تو بھٹکنا ہی بہتر ہے۔

آفس چھوٹنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے چلا گیا۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ قہقہے اچھل رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اپنے گھر تھے، بیوی بچے تھے یا ماں باپ تھے، دوست احباب تھے۔ وہ ایک مجھ سے کبھی مخاطب ہوئے لیکن وقت گزرنے کی فکر میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ کسی کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

"بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہو"، کسی نے کہا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو پھر کسی کے خیالوں میں ہو، شاید"، کسی اور نے شگفتگی سے کہا۔ "کہاں اپائنٹمنٹ ہے مسعود صاحب؟"

میں فقروں سے بچتا بچاتا باہر آ گیا۔ آفس سے باہر آ کر سوچنے لگا۔ اب کہاں چلا جائے۔ کیوں نہ سمندر کنارے چلوں۔ لیکن ٹھنڈ زیادہ ہے۔ اور پھر وہاں ہشاش بشاش چہرے دیکھ کر میری پژمردگی اور بڑھ نہ جائے۔ میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ میوزیم یا آرٹ گیلری چلا جائے۔ لیکن طبیعت اس طرف بھی راغب نہ ہوئی۔ جب کچھ نہ طے کر سکا تو میں یوں ہی ایک طرف چل پڑا۔ راستہ میں سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ سگریٹ کیس خالی تھا۔ سگریٹ کی دوکان تلاش کرنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک دوکان راہ میں پڑی۔ سگریٹ خرید کر میں چل پڑا۔ پتہ نہیں کب تک یوں ہی خالی الذہن چلتا رہا۔ جس سڑک پر میں چل رہا تھا اُس کے دونوں طرف دوکانوں کی قطاریں چلی گئی تھی۔ راستے پر بھی چیزیں بیچی جا رہی تھیں۔ غیر ملکی کپڑے سے لے کر ٹیپ ریکارڈ اور ٹرانزسٹر تک ہر چیز راستے پر بک رہی تھی۔ دوکانوں کی بہ نسبت یہاں

آدمی زیادہ تھے۔ لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں شاید میں ہی اکیلا بغیر کسی مقصد کے بھٹک رہا تھا۔ پیر دُکھنے لگے۔ سوچا کہیں بیٹھا جائے لیکن میں ہوں کہاں؟ اطراف میں دیکھا۔ میں ریگل سینما کے پاس تھا۔ یہاں دو ہوٹل تھے۔ ایک ہوٹل میں ریکارڈ بج رہا تھا۔ میں نے سوچا یہیں بیٹھا جائے۔ ہوٹل میں داخل ہوا تو یکایک جیسے ایک ہنگامے میں گھر گیا۔ کچھ عجیب سا لگا۔ ایک گوشہ میں ایک خالی کرسی دیکھ کر میں وہیں بیٹھ گیا۔ ہر میز پر دو دو تین تین آدمی باتیں کر رہے تھے یا بحث کر رہے تھے، یا پھر جھگڑ رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے مجھے محسوس ہوا جیسے گیت اور وہاں موجود لوگوں کی آوازوں میں ایک دوسرے پر غالب آنے کی کشمکش ہو رہی ہو۔ میں نے گیت سُننے کی کوشش کی۔ کبھی کبھی آوازیں مدھم ہونے پر گیت کا کوئی ٹکڑا کانوں سے آ کر ٹکرا تا۔ دھن مغربی تھی اور بول اُردو۔ ٹیبل والا آیا۔ اُسے میں نے چائے لانے کے لیے کہا۔ کسی ٹیبل سے کچھ لوگ اُٹھے۔ بیرا جو میرے پاس سے ہٹ ہی رہا تھا۔ زور سے چلایا۔ "صاحب لوگ کا ساڑھے پیسہ"۔ کرخت آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی گزری۔ دل چاہا فوراً اُٹھ جاؤں لیکن پیروں میں تکان تھی۔ ٹیبل والا دو منٹ بعد چائے رکھ کر گیا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اُتارا۔ کڑواہٹ نے منھ کا مزا خراب کر دیا۔ میں کچھ دیر تک کڑواہٹ محسوس کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کڑواہٹ بھلی لگنے لگی۔ ایک دوسرا مغربی طرز کا ہندوستانی گیت شروع ہوا۔ ایک بار پھر لوگوں کی آوازوں اور گیت کی آواز میں کشمکش ہونے لگی۔ میں سوچنے لگا۔ کس میں کڑواہٹ زیادہ ہے۔ گیت کے شور میں، لوگوں کے شور میں یا چائے میں۔ سوچتے سوچتے شاید سوچنے کی حس ہی ختم ہو گئی۔ یا اس شور نے ختم کر دیا۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں اُٹھا اور پیسے ادا کر کے باہر نکل آیا۔ اس ہنگامے سے نکل کر مسرت کا احساس ہوا۔ پھر یہ مسرت بھی آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئی۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا نے دماغ کو بھی کچھ ہلکا کر دیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اب میں سوچ سکتا ہوں لیکن سوچنے کے لیے تھا ہی کیا۔ سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں۔ دوکانیں بند ہو گئی تھیں۔ راستہ پر کہیں کہیں کوئی آدمی چلتا دکھائی دے جاتا۔ میں چلتا رہا یہاں تک کہ پیر پھر دُکھنے لگے۔ قمقموں کی روشنی میں میں نے دیکھا۔ ایک بس اسٹاپ قریب ہی تھا۔ میں نے سوچا۔ یہیں کچھ دیر آرام کیا جائے۔ ایک بس آئی۔ نمبر دیکھا تو خیال آیا کہ یہ بس تو میرے گھر کے قریب سے ہو کر جاتی ہے۔ اپنے کمرہ پر

چلنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے یہ آخری بس ہو۔ میں نے قدم تیز کر دیے۔ بس کے اسٹینڈ پر کنے تک میں پہنچ چکا تھا۔ بس پوری خالی تھی۔ بس میں بیٹھ کر تسکین کا احساس ہوا۔ یہ بس میرے لیے چل رہی ہے زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں۔

بس سے اُتر کر میں اپنی پناہ گاہ کی جانب چل پڑا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کچھ عجیب کیفیت ہونے لگی۔ دل نہ جانے کیوں جیسے بھر بھر آرہا تھا۔ زبان میں للس ہونے لگی۔ جی چاہنے لگا کچھ بھی بکنے، لگوں اور کوئی سنے۔ شرما جی کا خیال آیا۔ میں نے سوچا دونوں بوڑھے باتیں کر رہے ہوں گے۔ میرا جی چاہا کہ شرما جی مجھ سے کہیں "مسعود اتنی رات گئے کیوں آتے ہو تم نے اپنے جوتوں پر پالش نہیں کروائی۔ مسعود تمہیں اتنا لا پرواہ نہیں ہونا چاہیے۔" اب میں اپنے کمرے کے قریب تھا ادھ کھلے کواڑوں سے میری نظر چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔ شرما جی اور ٹھاکر صاحب باتوں میں معروف تھے اور کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میرا جی چاہا میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ لیکن میرا منہ کھلا رہ گیا۔ دونوں بوڑھے میری طرف دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک سنگین بے تعلقی تھی۔ برف کی سل کی طرح۔ میرا تمام جسم سرد ہو کر جیسے جم گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سینے میں کوئی چیز ٹوٹی اور میں نے صاف صاف کچھ ٹوٹنے کی آواز سُنی ———

قریب میں رکھی کرسی پر میں گر گیا۔ جوتے اُتار کر کپڑے تبدیل کیے بغیر بوڑھوں کی طرف پیٹھ کیے، اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ آنسوؤں کو چھپاتے جو خود بخود آنکھوں سے نکل پڑے تھے اور گالوں سے بہہ کر ہونٹوں پر سیٹھے سیٹھے لگ رہے تھے۔

★

شاندار موت کے لیے

ڈائنا کا لاغر جسم سفید بے داغ چادر پر پڑا ہے۔ سفید بے داغ چادر اوڑھے وہ لاش کی طرح لیٹی ہے۔ اُس کا چہرہ سفید ہو چکا، خون نچڑ چکا لیکن ایک آنکھ اب تک چمک رہی ہے۔ ڈائنا کی یہ آنکھ مصنوعی ہے اصلی آنکھ سے زیادہ چمکتی ہے۔

ڈائنا کا بھائی حسب معمول اپنے مصنوعی دانتوں کے سیٹ کو برش کر رہا ہے اور میں اپنی وِگ ہاتھوں میں لیے کنگھی کر رہا ہوں۔ ہم اپنا وقت اسی طرح گزارتے ہیں۔

چارلس یہیں تک رہا ہے۔ ہم اسے باہر بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے۔ کیونکہ بلڈنگ کے لوگوں کا سماجی مرتبہ مشکوک ہے۔ وہ ان لوگوں سے نہیں ملتے جن سے ہم ملتے ہیں۔

ڈائنا بہت بیمار ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ ڈائنا بھی جانتی ہے۔ اسی لیے وہ لیٹے لیٹے ہر وقت موت کے متعلق سوچتی رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے اس کی موت شاندار ہو۔ اسی لیے وہ روزانہ چادر بدلواتی ہے۔ کمرے میں روشنی بھی مدھم کر دی گئی ہے۔ باوجود بیماری کی شدت کے وہ باقاعدگی سے کپڑے تبدیل کرتی ہے۔ اگرچہ اس میں اس کی بہت ساری توانائی صائع ہو جاتی ہے۔

"ڈیوڈ!"

ڈائنا کی کمزور، سرگوشی جیسی آواز سُن کر ڈیوڈ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چل کر اس کی طرف جاتا ہے۔

"تم نے فوٹوگرافر کا بندوبست کر لیا ہے؟"

"فوٹوگرافر؟" ڈیوڈ کے چہرے پر استعجاب کے آثار نظر آتے ہیں۔
"فوٹوگرافر کس لیے؟"

"میری موت پر آنے والوں کی تصویریں نہیں اُتروا‏ؤ گے؟"

ڈیوڈ توصیفی نگاہوں سے ڈائنا کو دیکھتا ہے۔ ڈائنا واقعی جینیئس ہے۔

"میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھتا ہے۔

ڈائنا میری طرف دیکھتی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھتا ہوں اور ڈائنا کے قریب رکھی کرسیوں میں سے جو عیادت کے لیے آنے والوں کے لیے رکھی گئی ہیں۔ ایک پر بیٹھ جاتا ہوں اور بدستور روگ میں کنگھی پھیرتا رہتا ہوں۔

"ولیم! میری موت پر آنے والوں کی فہرست تم نے تیار کر لی؟" ڈائنا نرم لہجے میں مجھ سے پوچھتی ہے۔ میں گڑبڑا جاتا ہوں۔

"فہرست... فہرست کیسے بن سکتی ہے۔ پہلے سے کس طرح معلوم ہو کہ کون کون شریک ہوگا؟"

مدھم روشنی میں کمرہ جس کی پرانا فرنیچر جو قدیم دیوتاؤں کی مشہور پتھریلی چپ ہونٹوں پر لیے ہمیں گھورتا رہتا ہے، اور بھی پُراسرار ہو گیا ہے۔ یہ پُراسراریت مجھے پسند ہے اور ڈیوڈ اور ڈائنا کو بھی۔ صرف چارلس کو اس سے الجھن ہوتی ہے۔

"تمہیں تمام اہم آدمیوں کو میری موت کی خبر دینی ہوگی۔" ڈائنا اسی طرح شفیق لہجے میں کہہ رہی ہے۔

"ڈاکٹر نے کیا وقت بتایا ہے؟"

"کل کسی وقت"

"ٹھیک ہے ابھی کافی وقت ہے۔"

"فہرست میں ہیسٹر کا نام ضرور ہو اور زیرِ بحث۔ یہ دونوں تمہارے اچھے دوست ہیں ضرور آئیں گے۔"

"اور سیٹھ بتی موریا"

"ہاں سیٹھ بتی موریا"

"ہمارے محلے میں ایک فلم اسٹار بھی ہے۔"

"ہاں ایک فلم اسٹار بھی ہے۔"

"اسے بھی خبر کر دینا میں چاہتی ہوں میری موت کا ا لم یادگار ہو۔"

"تمہاری کمپنی کا چیرمین بھی۔"

"لیکن میں تو اب ریٹائر ہو چکا۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ مشہور آدمی ہے اور تمہارے خبر کرنے پر ضرور آئے گا۔"

"اور مسٹر بمبئی والی۔"

"ہاں مسٹر بمبئی والی۔"

"سب جج پٹھان"

"سب جج پٹھان"

"جسٹس آف پیس ٹھاکرے"

"جسٹس آف پیس ٹھاکرے۔"

"صرف بڑے آدمی جنازے میں ہوں۔ زیادہ بھیڑ نہ ہو۔ ان لوگوں کی موجودگی سے تمہاری اپنی اہمیت بڑھے گی۔"

"اور تمہاری بھی"

"ہاں میری بھی۔"

ڈائنا خاموش ہو گئی ہے۔ میں میز کے پاس آ گیا ہوں اور فہرست تیار کر رہا ہوں۔ میں کچھ سوچ کر اٹھتا ہوں اور دوبارہ ڈائنا کے قریب رکھی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ڈائنا کی آنکھیں بند ہیں جیسے وہ سو رہی ہو لیکن وہ سو نہیں رہی ہے۔ وہ جنازے کی تفصیلات پر غور کر رہی ہے تاکہ مجھے اور ڈیوڈ کو مناسب ہدایتیں دے سکے۔ کچھ دیر بعد وہ آنکھیں کھولتی ہے اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔

"تمہاری بہن کو بھی خبر کی جائے۔"

"نہیں" وہ ملائم لہجے میں کہتی ہے۔

"دوسرے رشتہ داروں کو بھی نہیں۔"

وہ سر ہلا کر "نہ" کہتی ہے۔

"لوگ کیا سوچیں گے، میرے رشتہ دار اتنے غیر اہم لوگ ہیں۔"

میں اُٹھ کر میز پر آتا ہوں، جب تک میں فہرست تیار کرتا ہوں۔ ڈیوڈ میرے قریب کھڑا فہرست میں شامل نام پڑھتا رہتا ہے اور کمرے کا فرنیچر مکینوں کو بدستور پتھریلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے۔

فہرست مکمل کر کے میں آرام کا سانس لیتا ہوں اور اپنی وگ میں دھیمے دھیمے کنگھی کرنے لگتا ہوں۔

"یہ عورت واقعی عظیم ہے" ڈیوڈ کہتا ہے۔

"یہ عورت واقعی عظیم ہے" میں کہتا ہوں۔

میئر، وزیر صحت، جسٹس آف پیس، بیرسٹر، فلم اسٹار، کتنا شاندار جنازہ اور سب محفوظ تصویروں میں۔"

"ہاں ایک شاندار موت"۔

"یہ عورت واقعی عظیم ہے" ڈیوڈ کہتا ہے اور اپنی مصنوعی بتیسی کو برش کرنے لگتا ہے۔

کس سے ملنا چاہیے اور کس سے نہیں اُسے معلوم تھا۔ ورنہ اتنے بہت سے بڑے آدمی اس کی موت میں شامل نہ ہوتے۔"

"کس سے ملنا چاہیے اور کس سے نہیں اُسے معلوم تھا ورنہ اتنے بہت سے بڑے آدمی اس کی موت میں شامل نہ ہوتے۔" میں دہراتا ہوں۔"

"وہ جانتی تھی۔"

"وہ جانتی تھی۔ میں دہراتا ہوں۔

"کب کون سے کپڑے پہننے چاہییں۔"

"کب کون سے کپڑے پہننے چاہییں۔"

"کب کیا باتیں کی جائیں"

"کب کس کی مدد کی جائے۔"

"کس کو کھانے پر بُلایا جائے۔"

"کس کو کھانے پر بُلایا جائے۔"

"اور کس کو چائے پر"۔

"کس سے ہنس کر ملا جائے۔"

"کس سے ہنس کر ملا جائے۔"

"کب ہنسنا چاہیے۔

"کب ہنسنا چاہیے۔"

"اور کب رونا چاہیے۔"

"اور کب رونا چاہیے۔"

"کتنا ہنسنا چاہیے۔"

"کتنا ہنسنا چاہیے۔"

"اور کتنا رونا۔"

"اور کتنا رونا۔"

"اِس لیے سماج میں اس کی بڑی عزّت تھی۔"

"اِس لیے سماج میں اس کی بڑی عزّت تھی۔"

"اور مقام"۔

"اور مقام"۔

"یہ عورت واقعی عظیم ہے،" وہ مصنوعی دانتوں کو برش کرتے ہوئے کہتا ہے۔"

"یہ عورت واقعی عظیم ہے۔" میں وگ میں کنگھی کرتے ہوئے دہراتا ہوں۔"

دو گھنٹے بعد ڈائنا نے ہمیں پھر بلایا۔
"تمہارے سیاہ سوٹ تیار ہیں ؟"
ہم نے "ہاں" کہا۔
"سوٹ اچھی طرح استری کیا ہوا ہو۔ اور سفید رومال جیب سے تھوڑا سا نکلا ہوا ہو۔ جوتوں پر بھی ٹھیک سے پالش ہو۔ قمیص بھی کلف کی ہو۔"
ہم نے سب باتیں ذہن نشین کرلیں۔
"چارلس کہاں ہے ؟"
چارلس جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اپنا نام سُن کر آیا۔
"تمہارا سیاہ سوٹ تیار ہے ؟"
"ہاں ڈیڈی نے نیا بنوایا ہے۔"
"بہت خوب" ڈائنا نے میری تعریف کی۔
مجھے خوشی ہوئی میں وگ میں جلدی جلدی کنگھی پھیرنے لگا۔
"جوتے پالش کیے ہوئے ہوں۔ چہرہ مُترا ہوا ہو لیکن آنسو نہ نکلیں ورنہ تصویریں خراب ہوجائیں گی۔" ڈائنا نے کہا۔
"فوٹوگرافر کو برابر بتاتے رہنا کب تصویر لی جائے۔"
چارلس نے سر ہلایا۔
"اور ڈیوڈ تم دانتوں پر پالش کروا لیتے تو بہتر ہوتا۔"
"وہ میں کروا چکا ہوں۔" ڈیوڈ نے فخر اور مسرت سے کہا۔
صبح میں نے میئر کو اور وزیر صحت کو اور فلم اسٹار کو اور سب جج کو اور جسٹس آف پیس کو، اور بیرسٹر کو ٹیلی فون کیے اور انھیں بتایا ڈائنا مر رہی ہے۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق آج کسی وقت۔ سب نے کہا وہ ضرور آئیں گے۔ انھیں دوبارہ ٹیلی فون کیا جائے، مجھے خوشی ہوگی۔ ڈیوڈ کو بھی اور ڈائنا کو بھی۔
"کتنی شاندار موت" ڈائنا نے کہا۔

"کتنی شان دار موت۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"کتنی شان دار موت۔" میں نے کہا۔

کمرے کا پرانا فرنیچر اور چارلس ہمیں خاموش نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

"بلڈنگ کے لوگ اگر آئیں تو" یکایک ڈیوڈ نے مصنوعی دانتوں کو برش کرتے کرتے رُک کر کہا۔

"انھیں دیوان خانے میں بٹھانا۔ اس کمرے میں نہ آنے دینا۔ انھیں جلدی رخصت کرنا۔ صرف بڑے آدمیوں کو اندر لانا اور فوٹوگرافر کو بھی اندر ہی کھڑا کرنا تاکہ وہ صرف یہاں آنے والوں ہی کی تصویریں لے۔

اس وقت ڈائنا بے ہوش ہے۔ فوٹوگرافر آچکا ہے۔ ہم لوگ سیاہ سوٹ اور پالش کیے ہوئے جوتے پہنے اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ کمرے کا فرنیچر بیتھر یلی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا ہے اور چارلس بھی۔

بھیڑیں

نوجوان پادری نے بس کی قطار میں کھڑے کھڑے بھٹکی ہوئی بھیڑوں کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ روزانہ وہ نا معلوم کتنے لوگوں کو راہ راست پر لاتا رہتا ہے۔ لیکن ان کی تعداد کبھی کم ہی نہیں ہوتی۔ پھر اسے بائبل کی تعلیم یاد آئی۔ کل کے لیے فکر نہ کرو کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا۔ آج کے لیے آج کا دن کافی ہے۔ ‏"وقت تھوڑا ہے اور کام بہت۔ اس نے سوچا۔ اسے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں نہ وہ واپس لوٹ جائے۔ پارٹی میں خواہ مخواہ وقت خراب ہوگا۔ لیکن پتہ نہیں کون کب راہ راست پر آ ئے۔ اسے ہر ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے پر لایا جا سکتا ہو۔ اسے ایک لمحہ بھی برباد نہیں کرنا چاہیے۔ اُس نے اپنے قریب کھڑے آدمی کو جو اخبار پڑھ رہا تھا۔ دیکھا۔ اس کے ساتھ کیسے بات چیت کا آغاز کرے۔ آخر کچھ سوچ کر اس نے اس سے پوچھا۔

"Do you have Soul? (کیا آپ کے پاس روح ہے)

"جی نہیں" اس شخص نے لاپرواہی سے کہا۔ "شاید ان کے پاس ہو۔"

اپنے پاس والے آدمی کی طرف اشارہ کر کے وہ آدمی پھر اخبار پڑھنے لگا۔

"کیا چاہیے آپ کو؟" جس آدمی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اُس نے پوچھا۔

"کیا آپ کے پاس رُوح ہے ؟" پادری نے انتہائی ملائمیت سے سوال کیا۔
"کبھی نہیں سُنا، یہ کیا چیز ہوتی ہے ؟" اُس آدمی نے پوچھا۔
"دیکھئے ابھی آپ زندہ ہیں۔"...... پادری نے خوش مزاجی دکھاتے ہوئے کہا کہ اسے گفتگو جاری رکھنے کا موقع مل گیا تھا۔
"دیکھیے جناب دن بھر دفتر کا کام کرنے کے بعد میں اس موڈ میں نہیں ہوں کہ کوئی لمبی تقریر سُنوں۔ آپ جانتے ہوں تو بتائیے یا بات ختم کیجیے۔" اُس آدمی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"یہی تو مشکل ہے۔ آپ کو پتہ نہیں۔ لوگ دنیاوی کاموں میں ایسے اُلجھے ہیں کہ جانتے نہیں کہ خدا کی حکومت..... پادری بےچارگی سے کہنے لگا۔
"دیکھئے جناب، مجھے پریشان مت کیجیے۔" اُس شخص نے جھلا کر پھر بات کاٹ دی۔ پادری نے داہنے ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ بس آئی۔ وہ سوار ہوا۔ اُس کا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا لیکن فرض بہرحال فرض ہے۔ پاس ــــــ بیٹھے طالب علم سے اُس نے پوچھا۔
"بچّے! تمہارے پاس رُوح ہے ؟"
"میری امّی مجھے ایک رُوپے سے زیادہ نہیں دیتیں۔" اُس بچّے نے جواب دیا۔ "تیس پیسے کی آئس کریم آجاتی ہے۔ ستّر پیسے بس کے کرائے کے ہوتے ہیں اور دوسری کوئی چیز میں کھاتا نہیں۔"
"نہیں رُوح کھانے کی چیز نہیں، وہ..... پادری انتہائی صبر سے اُسے سمجھانے جارہا تھا کہ بچّے نے بات کاٹ دی۔
"تب جانے دیجیے جناب! آپ یہ الجبرا کا سوال حل کرسکیں گے ؟ طالب علم نے پُوچھا۔
"جی نہیں، مجھے الجبرا نہیں آتا۔" پادری نے جواب دیا۔
"آپ نے اسکول کا امتحان پاس نہیں کیا" ؟ طالب علم نے حیرت سے

پوچھا۔ "صورت سے تو آپ پڑھے لکھے نظر آتے ہیں۔"
"میں۔ میں۔۔۔۔" پادری کو پسینہ آ گیا۔
طالب علم لاپرواہی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔
پادری پارٹی میں پہنچا۔ ایک دو پیگ کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ وہ خندہ پیشانی سے لوگوں کے ساتھ بات چیت میں معروف ہو گیا۔ لیکن سوال اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔
"کیا آپ کے پاس رُوح ہے؟" پاس کھڑی خاتون سے بات کرتے کرتے یکایک وہ پوچھ بیٹھا۔
"جی نہیں، میں ان فرسودہ باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔" خاتون نے جواب دیا اور اپنے قریب کھڑے لوگوں سے تمسخر آمیز لہجے میں پوچھا۔
"کیوں جناب، آپ لوگوں میں کسی کے پاس رُوح ہے۔؟"
پھر تو فضا میں مستقل قہقہے برسنے لگے۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے پوچھتا۔ "کیوں صاحب، آپ کے پاس رُوح ہے؟" اور ہنس پڑتا۔
پادری ہکا بکا ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے
"ہم تو تمہیں ایک خوش مذاق آدمی سمجھ رہے تھے۔ یہ آج تم نے کیا پٹا پٹایا سوال چھیڑ دیا۔" ایک شخص نے پادری سے کہا۔
اس سے قبل کہ پادری کچھ کہتا، کسی اور نے چھیڑا۔

"Realy Father You are the Soul of to days Party,"

"نادر کیا تمہارے پاس روح ہے؟" ایک نوخیز لڑکی نے چھیڑا۔ پھر قہقہے اُڑے۔

"ہاں میرے پاس روح ہے۔" پادری نے خود اعتمادی سے کہا۔
"تو دکھاؤ!" کئی آوازیں آئیں۔

"رُوح دکھائی نہیں جا سکتی۔" اُس نے کہا۔
"پھر تم بکواس کر رہے ہو۔" کوئی ایک چلاّیا۔
"آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔" پادری نے جوش سے کہا۔
"ہم سُنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر تم کہتے ہو کہ کسی چیز کا وجود ہے تو تمہیں دکھانا ہوگا۔"

نوجوان پادری جھنجلا کر باہر آ گیا۔ بس پکڑ کر وہ چرچ واپس آیا اور مسیح کے مجسمے کے سامنے جھکنے لگا۔ لیکن وہ مجسمے کو گھورتا رہ گیا۔ سفید مرمریں پتھر سے بنا مسیح اُسے بالکل بے جان لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ریورنڈ فادر ڈانش کے پاس آیا۔

"آؤ آؤ، کیا بات ہے، تمہاری طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے۔" ریورنڈ فادر ڈانش نے کہا۔

"فادر، کیا آپ کے پاس رُوح ہے؟" نوجوان پادری نے پوچھا۔

"کیا؟" ریورنڈ فادر اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اُس نے اُس کے کندھے تھپتھپائے اور کہا۔ "بچے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم بہت زیادہ کام کرنے لگے ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ دو تین دن مکمل آرام کرو۔"

وہ اپنے کمرے میں بستر پر گر گیا۔ رات دیر تک اُسے نیند نہیں آئی۔ دوسرا روز گزرا، تیسرا روز گزرا، کئی دن گزر گئے۔ ہر شخص اپنے کام میں، اپنی فکروں میں مگن تھا۔ بھیڑوں کی تعداد ہمیشہ جتنی ہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا یہ سب غلط ہیں اور میں صحیح ہوں۔ ہو سکتا ہے یہی لوگ صحیح ہوں۔ کیا یہ دُرست ہے کہ قیاس کو ثبوت نہیں مانا جا سکتا؟

اُس شام پادری باہر نکلا تو سوچ سوچ کر نڈھال ہو چکا تھا۔ راستے پر کچھ بچے دوڑ لگا رہے تھے۔ کچھ نوجوان قریب کے میدان میں کھیل رہے تھے۔

بہت سے لوگ خوشی خوشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ یہ سب لوگ غلط نہیں ہو سکتے اُس نے سوچا۔ میں دُنیا کو ٹھیک کرنے نکلا ہوں جب کہ شاید مجھے خود کو ٹھیک کرنا چاہیے۔ غالباً رُوح کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سوچ کر اُس کا دماغ ہلکا ہو گیا۔ وہ بے ساختہ زور سے ہنس پڑا۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اُس نے خود سے کہا۔ اپنے جسم کو میں نے کتنی اذیت پہنچائی ہے۔ کتنی خوب صورت زندگی ہے یہ۔ یہاں ہر چیز دُرست ہے۔ مسرّت کی لہر اُس کے بدن میں دوڑ گئی۔ مجھے گزرے ہوئے دنوں کی تلافی کرنی چاہیے۔ اُس نے سوچا اور نکڑ کے شراب خانے میں چلا گیا۔ کوئی میز خالی نہیں تھی۔ ایک میز پر ایک کرسی خالی دیکھ کر وہ اُس کی طرف بڑھ گیا۔ ایک مزدور اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ دو تین پیگ چڑھانے کے بعد اس کی طبیعت کسی سے بات کرنے کو چاہی۔

"کیا تمہارے پاس رُوح ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" اُس آدمی نے جواب دیا۔ وہ بُری طرح پیئے ہوئے تھا۔

"کیا؟" پادری چونک پڑا۔ "تمہارے پاس روح ہے؟"

"ہاں!" اُس آدمی نے سکون سے اپنا جواب دُہرایا۔

"تو دکھاؤ۔" نوجوان پادری نے کہا۔

اُس مزدور نے ایک نظر پادری کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس روح ہے؟"

"نہیں!" نوجوان پادری نے نشّے سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو تم دیکھ نہیں سکتے" مزدور نے کہا۔ "تم تباہ ہو چکے ہو، تم جہنّمی ہو۔ تم برباد ہو گئے ہو۔" وہ چیخا۔

پادری کا نشّے میں ڈولتا بدن لرز گیا۔ وہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ "میں بھی برباد ہو چکا ہوں۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں تباہ ہو چکا ہوں، میں جہنّمی ہوں۔" وہ میز پر سر رکھ کر رونے لگا۔

شراب خانے میں کھلبلی مچ گئی۔ "یہ کون ماحول درہم برہم کر رہا ہے؟"
شراب خانے کے مالک نے اُس پیے ہوئے آدمی سے پوچھا۔
"کیا بات ہے۔"
"یہ آدمی تباہ ہو چکا ہے۔" اُس مزدور نے کہا۔ "کہتا ہے اُس کے پاس رُوح نہیں۔ آج کل پادریوں کا یہ حال ہے۔"
سب نے مل کر پادری کو اُٹھایا اور شراب خانے کے باہر ڈال دیا۔ اور افسوس کرتے ہوئے دوبارہ شراب خانے میں چلے گئے۔
نوجوان پادری فٹ پاتھ پہ بیٹھا روتا رہا۔ "میں تباہ ہو گیا۔ میں برباد ہو گیا۔"

★

لمبا آدمی

میرا قد اچانک اتنا بڑھ گیا تھا۔ مجھے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ اور لوگ مجھے حیرت سے تو نہیں دیکھ رہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ میرے وجود سے بھی غافل ہیں۔

سگریٹ کی ایک دوکان دیکھ کر میں رُک گیا۔ جیب سے پیسے نکالے اور بڑی مشکل سے جھک کر اُسے دیئے اور سگریٹ مانگا۔ سگریٹ لے کر میں نے وہیں کھڑے کھڑے سلگایا اور ایک کش لے کر دوکان دار کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔ اُس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے مایوسی ہوئی۔ میں پھر چل پڑا۔ گھر کے قریب کئی ایک دوست ملے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن کسی نے بھی میرے قد میں اضافہ ہو جانے پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اُن سے رخصت ہو کر میں اپنے مکان کی طرف بڑھا۔ مکان کے قریب والد صاحب ملے۔ میں نے انھیں سلام کیا۔

"کام پر سے لوٹ رہے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

میں نے کہا "ہاں"۔ گھر والوں کے پاس بات چیت کے لیئے بھلا موضوع ہی کیا ہوتا ہے؟ ہم دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ دروازہ پر آ کر میں رُک گیا۔ والد اندر داخل ہو چکے تھے۔ لیکن انھیں فوراً ہی احساس ہوا کہ میں اُن کے ساتھ نہیں ہوں۔

وہ بیٹھے۔

"کیوں باہر کیوں رُک گئے ؟"

"میں اندر کس طرح داخل ہو سکتا ہوں !"

"کیا مطلب ؟"

"یہ دروازہ....."

"دروازہ کیا ؟

اُن کے چہرے کی جھریوں میں مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا پاگل پن ہے۔"

میں بڑی مشکل سے جُھکا اور ہاتھوں کو زمین پر ٹیکتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔

"ارے رے، ارے، یہ کیا کر رہے ہو، پاگل ہو گئے ہو کیا ؟"

کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں سیدھا کھڑا ہوا۔ میرا سر چھت سے لگ رہا تھا پھر بھی مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ میرا قد کمرے میں سما کیسے گیا۔

کھانے کے بعد میں نے کھڑکی سے قریب کرسی کھسکائی اور بیٹھے بیٹھے اپنے اندر اس تازہ ترین تبدیلی کے متعلق سوچنے لگا۔ کتنی دل چسپ اور عجیب بات۔ میں ہنس پڑا۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟ میری بیوی نے جو بستر پر لیٹے لیٹے کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں، میں نے جواب دیا۔

مجھے تعجب ہوا کہ اُس نے بھی میرے قد بڑھ جانے کا نوٹس نہیں لیا۔

"آج سونے کا ارادہ نہیں ؟" بیوی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں اُٹھا اور آہستہ آہستہ ڈگ بھرتا پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو ؟" جب میں کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا تو میری بیوی نے کہا۔

"یہ پلنگ تو بہت چھوٹا ہے۔"

"ایں ؟"

"میں اس میں کیسے لیٹ سکوں گا؟"

"روز کیسے لیٹتے ہو؟" وہ مسکرائی جیسے میرے مذاق سے محظوظ ہو رہی ہو۔

"لیکن اب۔۔۔" میں کہتے ہوئے ہچکچا گیا۔

"اب کیا؟" وہ ہنسی

کچھ کہنا فضول سمجھ کر میں لیٹ گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ارے تمہارے پیر تو پلنگ سے باہر نکلے جا رہے ہیں؟" اُس نے کہا۔ اور ہنستے ہوئے مجھ پر گر پڑی

وہ مذاق کر رہی تھی۔ میں پلنگ میں سما گیا تھا مگر کیسے؟ مجھے خود تعجب ہو رہا تھا۔

صبح ناشتہ کی میز پر میری بیوی نے رات کا واقعہ بیان کیا تو والد صاحب نے بھی پچھلی شام گھر میں جھک کر داخل ہونے کی بات بتائی۔ سب خوب ہنسے۔

آفس جاتے ہوئے مجھے گھر سے جھک کر ہی باہر نکلنا پڑا۔ لیکن کسی نے دیکھا نہیں۔ آفس میں البتہ لوگوں نے مجھے جھک کر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اُنھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اُن کے استفسار پر میں نے بتایا کہ میرا قد لمبا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ بہت ہنسے۔ ان کے خیال میں میں مذاق کر رہا تھا۔ کھانے کے وقفے کے دوران جب ہم گپ شپ میں مشغول تھے، میرے لمبے قد کی بات چھڑ گئی۔ وہ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے کہ واقعی اگر آدمیوں کے قد لمبے ہو جائیں تو کتنی دور تک دیکھ سکیں۔ کتنا تیز چل سکیں۔ کتنے بڑے بڑے مکان بنانے پڑیں۔ لیکن عجیب بات تھی اُنھوں نے میرے قد کا نوٹس نہیں لیا۔

لیکن جب روزانہ میں اسی طرح گھٹنوں کے بل آفس میں اور گھر میں داخل ہوتا اور باہر نکلتا رہا تو سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُنھیں بڑی مشکل سے یقین آیا کہ میں مذاق نہیں کر رہا۔ اب ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ گھر والوں نے یکے بعد دیگرے کئی ڈاکٹروں کو بلوایا اور کمپنی نے بھی مجھے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ خیریت ہوئی۔ چونکہ میں کام ٹھیک کر رہا تھا اس لیے مجھے ملازمت سے برخاست نہیں کیا گیا۔

کئی ڈاکٹر آئے اور گئے۔ کسی نے دوائیں دیں۔ کسی نے انجکشن اور گولیاں۔ لیکن کسی کا

بھی علاج کارگر نہیں ہوا۔ وہ بجائے اس کے کہ میرا قد کم کرتے میرے ذہن سے اس خیال کو محو کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ میرا قد لمبا ہے۔

پھر ایک دن انھوں نے مجھے مُردہ قرار دے دیا۔ یہ میرے لیے انتہائی حیران کُن بلکہ پریشان کن بات تھی۔ ایک ڈاکٹر نے میری موت کا تصدیقی سرٹیفکٹ دیا اور انھوں نے مجھے سفید کپڑوں میں لپیٹ کر تابوت میں اُتار دیا۔ کندھوں پر لاد کر وہ مجھے قبرستان لے چلے۔ میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں "میں چیختا رہا۔ مگر کسی نے نہیں سُنا۔ قبرستان پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک تازہ کھدی قبر میں مجھے ڈال کر مٹی سے ڈھانپ دیا۔

"جو شخص اپنے کو اتنا اونچا سمجھتا تھا وہ اتنی چھوٹی سی قبر میں سما گیا ہے۔" کسی نے کہا۔

وہ لوگ مجھے مٹی میں دبا کر چلے گئے۔ میں بڑی دیر تک لیٹا رہا۔ آنسو جو اب تک رُکے ہوئے تھے آہستہ آہستہ پلکوں سے اُترتے اور مٹی میں جذب ہوتے رہے۔ پھر نہ جانے میں کب سو گیا۔ بڑی دیر بعد جاگا تو مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں سے گزر کر دل و دماغ کو تھپک رہی تھی۔ میرا جی چاہا، اُٹھوں اور باہر آ جاؤں۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی میں باہر نکل آیا۔ ہلکی ہلکی دھوپ اور مست خرام ہوا سے لطف اندوز ہوتا میں گھر کی طرف چل پڑا۔

میری بیوی سوگوار چہرہ لیے پلنگ پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا نام لے کر پکارا۔ وہ ایک لمحے کو رُکی۔ پھر رونے لگی۔

"میں زندہ ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ روتی رہی۔

"میں زندہ ہوں، تمھارے پاس بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔

میری ماں داخل ہوئی،

"مت رو بیٹی۔" انھوں نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے۔ وہ میرے پاس بیٹھے ہوں۔ میرے دماغ میں نہ جانے کیسے کیسے خیال ہیں۔"

"میں سچ مچ تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں روتی رہیں۔ میں تنگ آکر اُٹھا اور شہر میں بھٹکنے لگا۔ شام ہونے لگی تو میں اپنے دوست کے گھر چلا گیا وہ لوگ میرے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے۔

"بے چارہ بہت اچھا آدمی تھا۔ آخر آخر میں البتہ ذہنی توازن کچھ بگڑ گیا تھا۔"

"یہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔

انھوں نے سُنا ہی نہیں۔

"بے چارہ بڑی کم عمری میں مر گیا۔"

"یہ غلط ہے، میں زندہ ہوں۔"

میں غصے میں باہر آیا۔ جنون میں میں نے ایک ایک راہگیر سے کہا۔ "میں زندہ ہوں۔" ایک ایک گھر پر دستک دی۔ مگر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ تھک کر میں اپنی قبر کی طرف لوٹا۔

قبرستان میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا۔ بہت سارے لوگ اپنی اپنی قبروں پر بیٹھے مایوس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

میں اُن کے قریب پہنچا۔

پھر انھوں نے تسلیم کیا کہ تم زندہ ہو۔ "تمہارا قد بہت لمبا ہے۔" انھوں نے پوچھا۔

"یہ بات وہ مان لیتے تو میں لوٹتا ہی کیوں؟" میں نے جواب دیا۔

"یہی تو مشکل ہے۔" انھوں نے کہا۔ "وہ تصدیق نہیں کرتے اور جب تک وہ تصدیق نہیں کرتے۔"

غمگین چہرے لیے وہ دوبارہ اپنی قبروں میں سما گئے۔ میں کچھ دیر تک گہری خاموشی میں رات کی سیاہ دبیز چادر کو محسوس کرتا رہا۔ پھر مضمحل قدموں سے اپنی قبر کی طرف بڑھا۔ قبر کے پاس آکر میں نے اپنے قد کو اوپر سے نیچے تک تاسف سے دیکھا۔ پھر شہر کی جانب۔ شہر نے چُپ سادھ رکھی تھی۔

میں اپنی قبر میں اُتر گیا۔

صداؤں سے بنا آدمی

وہ سڑک پر کیسے آیا؟

شیر بازار کے دلال، جینتی لال نے تعجب سے سوچا۔

ابھی تو وہ اپنے ایرکنڈیشنڈ بنگلے کے ایک آرام دہ کمرے میں صوفہ پر دراز موسمبی کا رس پی رہا تھا۔

دھوپ ———

نیلا آسمان ———

رنگ برنگے پھول ———

اور ٹیڑھی میڑھی گلیاں ———

اُس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

کھلونے کی مانند خوبصورت بنگلہ اُسے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

——— بنگلہ کمروں میں منقسم ہے۔ کمروں میں ٹیلی فون براجمان ہیں۔ گھنٹیاں اعداد و شمار اُگلتی ہیں۔ اعداد و شمار نے بنک کی پاس بک بنائی۔ بنک کے پاس بک نے بنایا سیمنٹ کا نکریٹ کی اونچی عمارتوں کا جنگل جو ہونٹوں پر پتھریلی چپ لیے بنگلے کے عقب سے تک رہا ہے۔

جینتی لال تم سڑک پر کیسے آئے؟

——— اس کے قدم غلط پڑ گئے

——— وہ بے دھیانی میں یہ حرکت کر بیٹھا۔

——— وہ ہمیشہ سے سڑک پر ہے۔

جینتی لال نہیں جانتا۔ وہ صرف ٹیلی فون کی گھنٹیوں کی زبان سمجھتا ہے۔

دھوپ ———

نیلا آسمان ———

رنگ برنگے پھول ———

ٹیڑھی میڑھی گلیاں ———

پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش کیوں ؟

پیچھے ایرکنڈیشنڈ بنگلہ ہے۔ بنگلہ کمروں میں منقسم ہے۔ کمروں میں ٹیلی فون براجمان ہیں۔ گھنٹیاں بجاتے رہتے ہیں۔ گھنٹیاں اعداد و شمار اگلتی ہیں۔ اعداد و شمار نے بنک کی پاس بک بنائی۔ پاس بک نے بنایا سیمنٹ کا جنگل۔

سیمنٹ کا جنگل بنگلے کے صدر دروازے سے شروع ہوتا ہے۔

سیمنٹ کا جنگل دھوپ کو روک لیتا ہے۔

نیلا آسمان / سیمنٹ

رنگ برنگے پھول / سیمنٹ

ٹیڑھی میڑھی گلیاں / سیمنٹ

جینتی لال کہاں جائے ؟

نیلے آسمان کا بلاوا ——— آؤ میری باہوں میں چھپ جاؤ۔

رنگ برنگے پھولوں کی سرگوشی ——— ہمارے بے آواز نغمے ابدی سازوں کے امین ہیں۔

ٹیڑھی میڑھی گلیاں آغوش وا کیے منتظر ہیں۔ ہمارے سنگ طلسماتی دنیاؤں کو چلو دنیائیں جن میں عجیب و غریب لوگ رہتے ہیں۔ انجانے جذبوں سے سلگتے لوگ۔ محبت و

و نفرت، دوستی و دشمنی، تبسم و گریہ وزاری، ہجوم و تنہائی، عجیب و غریب لوگ جن سے بستیاں آباد ہوتی ہیں۔

جینتی لال کہاں جائے؟

زندگی / سیمنٹ

جینتی لال —— اٹھاون سالہ جینتی لال —— شیئر بازار کا دلال جینتی لال۔
ٹیلی فون کی گھنٹیوں سے بنا جینتی لال —— کیا جینتی لال کو گھنٹیوں کی صداؤں نے نہیں بنایا؟ جینتی لال ایک غیر مرئی انسان ہے — گوشت پوسٹ کا جسم ایک خوش نما بیکٹ جس میں ٹیلی فون کی صدائیں بھرتی جاتی ہیں — جینتی لال آگے بڑھو —— جینتی لال پیچھے ہٹو۔ جینتی لال، غیر مرئی جینتی لال۔

گم نامی، بھوک / ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ، امپالا کار، ٹیلی فون کی گھنٹیاں، بنک کی پاس بک

ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ + امپالا کار + ٹیلی فون کی گھنٹیاں + بنک کی پاس بک = غیر مرئی جینتی لال۔

نیلے آسمان کا بلاوا: آؤ میری باہوں میں چھپ جاؤ۔

رنگ برنگے پتوں کی سرگوشی: ہمارے بے آواز نغمے ابدی رازوں کے امین ہیں۔

ٹیڑھی میڑھی گلیاں آغوش وا کیے منتظر ہیں۔ ہمارے سنگ طلسماتی دنیا میں چلو۔ دنیا ئیں جن میں عجیب و غریب لوگ رہتے ہیں۔ انجانے جذبوں سے سلگتے لوگ۔ محبت اور نفرت، دوستی اور دشمنی، تبسم و گریہ زاری، ہجوم اور تنہائی۔ عجیب و غریب لوگ جن سے بستیاں آباد ہوتی ہیں۔

غیر مرئی جینتی لال کیا سوچ رہے ہو؟ آگے کیوں نہیں بڑھتے؟

میری شناخت (Identity) پیچھے ہے۔

تمہاری شناخت؟

ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ + امپالا کار + ٹیلی فون کی گھنٹیاں + بنک کی پاس بک

میں آگے نہیں جا سکتا۔

زندگی / سیمنٹ

میں پیچھے ہٹ نہیں سکتا۔

گم نامی / شناخت

میں آگے بڑھ نہیں سکتا۔

خبر: جینتی لال، اپنے بنگلے میں لوٹ آیا۔ پھر کبھی سڑک پر نہیں گیا۔
نظر: جینتی لال ہمیشہ سڑک پر رہا، وہ پھر کبھی بنگلہ کو لوٹ نہ سکا۔

★

سایہ اور سنت

سورج کے کھردرے ہاتھوں کی چبھن نے اُسے جگادیا۔ دن عمارتوں، میدانوں پہاڑوں اور راستوں پر پھیلا پڑا تھا۔ اُس نے بدن سے دوراز کار خیالات اور موہوم اندیشوں کے گرد و غبار کو جھاڑا۔ جسم سے لپٹی وجود کی چادر ٹھیک کی۔ بے حاصلی کے پانی سے مُنہ دھویا اور استقامت کی لاٹھی ٹیکتا آگے چل پڑا۔

زمین ان دیکھے سایہ کی زد میں ہے۔ عمارتیں، فوارے، آدم و انس ایک نظر میں شاداب اور خوب صورت لگتے ہیں لیکن غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے انھیں پالا مار گیا ہے۔ ہنستے بچّوں کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ عمارتوں کو دیکھکر دل دہشت کھا جاتا ہے۔

اہرمنی آوازیں دُور تک اس کے پیچھے آئیں مگر وہ ان کی پروا کیے بغیر چلتا رہا۔ راستے، میدان، وادیاں۔ سایہ ابھی دکھائی سا دیا۔ ابھی غائب۔ سایہ ابھی کسی پتھّر کے پیچھے تھا۔ ابھی کسی ستون کی آڑ میں۔ ابھی کسی شخص کے پیچھے۔ وہ بڑھتا رہا، بڑھتا رہا مگر سایہ کو نہ پا سکا۔

لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ وہ سایہ کی زد میں ہیں۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ وہی بلا مقصد ہما ہمی، ہنسی، ٹھٹھا

وہ جانتے ہیں، وہ سایہ کو نہیں پا سکتے۔ سایہ پر وہی قابو پا سکتا ہے جو برف کی طرح شفاف، دودھ کی طرح سفید، مصر کی روئی کی طرح ملائم ہو۔ جس کا کسی سے تعلق نہ ہو اور سب سے تعلق ہو۔ جس کی کوئی زمین نہ ہو اور ساری زمین جس کی ہو۔

پھر انھوں نے اسے کیوں نہیں پہچانا؟ شاید وہ پہچان گئے تھے لیکن انھوں نے ظاہر نہیں کیا۔ وہ خود بھی اس سے خوف زدہ تھے۔ اپنی صلیب اٹھا کر اُس کے پیچھے چلنے کی نہ ان میں ہمت تھی۔ نہ کاروبار زمانہ سے خود کو علاحدہ کرنے کی جرأت۔ اسے کسی نے روکا نہیں لیکن کسی نے ساتھ بھی نہیں دیا۔ مسافت تمام اسے اکیلے ہی طے کرنی تھی اور یہ سب وہ انھی کی محبت میں تو کر رہا تھا۔

دوپہر کا سورج سوا نیزے پر اُتر کر اس پر آگ برسانے لگا تو اس نے ایک گھنے درخت کے نیچے پناہ لی۔ تب اُس نے دیکھا کہ اس کے پیر خون سے لہولہان ہیں۔ سایہ یقیناً کہیں آس پاس ہی تھا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔ سایہ گلی کے لڑکوں کے پیچھے سے پتھر برسا رہا تھا۔ ناچار وہ اُٹھا۔ "اے خدا یہ نادان ہیں، انھیں معاف کردے" کہتا ہوا وہ پھر راستے پر ہو لیا۔ سایہ لڑکوں کے پیچھے ہنستے ہوئے مذاق اُڑاتے ہوئے دور تک اس کے پیچھے آیا۔ پھر غائب ہو گیا۔

لوگ سایہ کو ہی نہیں اسے بھی نظر انداز کر چکے تھے۔ جیسے اس کے وجود سے واقف ہی نہ ہوں۔ مگر پھر بھی وہ اُن کے لیے ہر طرح کی صعوبتیں جھیلنے کے لیے تیار تھا۔ وہ بے خطر آگ میں کود سکتا تھا۔ سمندر کو چیر سکتا تھا۔ مگر اُسے معلوم تھا۔ جب تک وہ سایہ پر قابو نہیں پاتا سب بے کار ہے، دوزخ کا دہانہ کھلا ہوا ہے اور لوگ ہیں کہ اس میں گرنے کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔

وہ عاد سے گزرا اور ثمود سے اور سدوم سے اور مدین سے اور آگ اور گندھک کی بو سونگھتا بڑھ گیا۔ دھرتی اہر منی آوازوں کے شور سے ڈھک گئی۔ سایہ ہر درخت اور ہر عمارت، ہر ستون کے پیچھے سے پتھر برسانے لگا لیکن وہ بے خوف اٹل ارادہ کی پناہ میں چلتا رہا۔ یہاں تک سورج نے جلتی مشعلوں کو

سمیٹا اور مغربی پہاڑیوں کے پیچھے اُتر گیا۔ آرام اُسے تب بھی نہ ملا۔ رات ایک مہیب دیونی کی طرح بال نوچتی آئی اور سرد ہواؤں کے ناخن اس کے جسم میں گڑو دیے۔ سکوت نے راستوں پر ڈیرا ڈال دیا۔

اُس کے لہو لہان تلووں میں ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔ وہ رُکا اور برگد کے پیڑ کے نیچے کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ رات نے اپنے سیاہ بازوؤں میں اُسے کس لیا۔ جھینگر سانسوں سے اتر کر رگوں میں بولنے لگے۔ سایہ کی بے شمار شعلہ بار آنکھیں درختوں کے پتّوں سے گھورتی رہیں مگر وہ اپنی جڑوں میں اُتر گیا تھا۔ قطرہ قطرہ، کتنے ہی لمحے، کتنے دن، سال صدیاں، اس کی رُوح میں چھنتی رہیں تب پل کے ہزارویں نقطہ سے روشنی کی ایک کرن نکل کر اس کے رگ و ریشے میں سرایت کرتی خون میں تحلیل ہو گئی۔ بے پناہ طاقت نے اُسے اُٹھا کر کھڑا کیا۔

تب ۔ تب اُس نے حیرت سے دیکھا۔ سایہ اور اس کے بیچ اَن گنت لوگ حائل ہیں وہ پھر بھی خود اعتمادی سے آگے بڑھا کہ ان کی بھلائی اس کی زندگی کا واحد مقصد تھی۔ لیکن اس وقت کروڑوں لوگ چیخ اُٹھے۔

" نہیں نہیں، سائے کو نہ کاٹنا، ہم روشنی برداشت نہیں کر سکتے۔"

غصّہ اور صدمے سے اس نے ان کی طرف دیکھا اور غش کھا کر گرا۔ اُس کے دل کی دھڑکن رُک گئی۔

" لائٹ ہیز گون آؤٹ ۔ ایک ماتمی صدا گونجی۔ سینکڑوں اَن دیکھے مائیکرو فونوں نے ایتھر کے پژمردہ کاندھوں پر لاد کر اسے وادیوں، میدانوں، پہاڑوں پر بچھا دیا۔

اب راستوں پر خاک اُڑتی ہے، عمارتیں کھنڈر لگتی ہیں۔ لوگوں کے چہرے پہلے سے زیادہ ویران اور خوف ناک ہو گئے ہیں۔ بلا مقصد ہنسی ٹھٹّھا اور ہماہمی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

★

انتظار

یہ سنگین عمارت جو صدیوں سے دھرتی اور اُس کے باسیوں کے سینوں پر مونگ دل رہی ہے آج بھی اتنی ہی مضبوط نظر آتی ہے جتنی اپنی تعمیر کے وقت رہی ہوگی۔ تب سے آج تک اس کے مکین بدلتے رہتے ہیں۔ ہر آنے والا پہلے والے کو ہٹا کر نئی عمارت فضول سمجھتے ہوئے اسی میں بسیرا کرتا ہے۔ اس لیے اس عمارت میں جہاں لوگوں کی زندگی اور موت، غربت و امارت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کے مکینوں کی روش کبھی نہیں بدلی۔ لیکن میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس عمارت کے دروازے پر نصب دو پتھر کے شیر اک روز زندہ ہوں گے اور ان کی چنگھاڑ سے یہ عمارت گر جائے گی۔ پھر امن ہی امن ہوگا اور خوش حالی۔

"کیا تمھیں اس بات پر یقین ہے؟" میں اپنے دوست سے پوچھتا ہوں۔

"دیومالائی روایات سے ہمارا ماضی بھرا پڑا ہے۔ ہمارے آبا و اجداد نے اور کیا ہی کیا ہے۔ مجھے تو یہ سب باتیں فضول لگتی ہیں۔" میرا دوست جواب دیتا ہے۔ "یہ شیر بھی ہم لوگوں کی طرح پتھر کے ہیں اور کبھی جاگنے والے نہیں۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ پتھر کے شیر ضرور جاگیں گے۔ روایتیں کبھی غلط نہیں ہوتیں۔"

وقت منجمد ہے۔ میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں قطار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ سینکڑوں

لوگ واپس جا چکے ہیں۔ کیونکہ ایک روز میں صرف سو آدمی لیے جاتے ہیں۔ میں صبح آٹھ بجے ہی آگیا ہوں۔ اس لیے میرا نمبر پہلے پچاس ہی میں ہے۔ دو گھنٹے تک قطار میں کھڑے رہنے کے بعد اندر آیا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے میں اپنے سرٹیفکیٹ پر نظر دوڑاتا ہوں۔ تاریخ جغرافیہ، فارسی، حساب، الجبرا، سائنس، اُردو، ہندی، انگریزی، ان مضامین سے اسکول کی اور اساتذہ کی نہ جانے کتنی ہی حسین یادیں وابستہ ہیں جو مرتے دم تک ساتھ رہیں گی۔ لیکن آج یہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں؟ مجھے اپنی ماں کا چہرہ یاد آتا ہے۔ جس نے خوشی خوشی ناشتہ کروا کے بھیجا ہے جیسے اسے یقین ہو کہ ایمپلائنٹ ایکسچینج میں قدم رکھتے ہی مجھے ملازمت مل جائے گی۔

میری باری آتی ہے۔ کلرک نام دپتہ وغیرہ لکھتا ہے اور پوچھتا ہے کون سی ملازمت چاہیے آپ کو؟ "کلرک کے سوا اور کون سی ملازمت یہاں ایک پڑھے لکھے آدمی کو مل سکتی ہے۔" میں اس سے کہتا ہوں۔

وہ خاموشی سے خانہ پُری کرتا ہے اور کہتا ہے "ہر تین مہینے بعد کارڈ پر تاریخ بڑھاتے رہنا۔"

تمہارا کیا خیال ہے، مجھے کب تک ملازمت مل جائے گی؟" میں پوچھتا ہوں۔

"یہاں ہر روز سو آدمیوں کے نام کا رجسٹر میں اندراج ہوتا ہے۔" وہ دانت نکال کر کہتا ہے "اور آج کے دن سے پہلے سینکڑوں دن گزر چکے ہیں۔ اس لئے یاد میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

مجھے اپنی ماں کا خیال آتا ہے۔ بھاری قدموں سے باہر آتا ہوں۔

دن گزرتے جاتے ہیں۔ میں گھر والوں کی پُر امید نظروں سے بھاگ کر لائبریری میں منہ چھپاتا ہوں۔ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، معاشیات، پیٹ بھرے لوگوں کی دماغی اُڑانیں، دل بہلاوے اور وقت گزاری کے کھیل۔ میں بے حس ہوتا جا رہا ہوں۔ کتنی اچھی بات ہے۔

فقیروں کی بڑھتی ہوئی تعداد، بس اسٹاپوں پر لمبی قطاریں۔ ایمپلائمنٹ

اسٹیشن پر ہر روز سو آدمیوں کی قطار، ہر روز ایرانی کے ہوٹل میں چائے پی کر اخبار دیکھتے ہوئے سوچتا ہوں کیا ان شیروں کے جاگنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔

ایک سال، دو سال، تین سال، ماں کے چہرے پر لکیریں بڑھتی جا رہی ہیں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ وقت دھیرے دھیرے پگھلتا ہے۔ ڈیڑھ سو روپوں کی ملازمت مل جاتی ہے۔ برسوں کے بعد ماں کے چہرے پر مسکراہٹ آتی ہے۔ پان منہ میں ڈالتے ہوئے اب باپ گھر والوں کو اس طرح نہیں دیکھتا گویا جرم کر رہا ہے۔

اپنے سوکھے جسم کو لے کر میں آفس میں قدم رکھتا ہوں۔ باس کی سرپرستانہ نگاہوں کے آگے احساس شکر سے دُہرا ہو جاتا ہوں۔ باس کا بوڑھا کلرک چشمے کے پیچھے سے غم زدہ نظروں سے دیکھتا ہے اور کام سمجھانے لگتا ہے۔ آفس میں انسانی ڈھانچے مشینی حرکتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ صرف ایک ٹائپسٹ ہے جو آفتاب کی روشنی اور حدت اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔ ڈھانچے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ دبک کر فائلوں پر جھک جاتے ہیں۔

بوڑھا کلرک بولتے بولتے رُکتا ہے۔

"شکریہ انکل۔" میں ادب سے اُس کے آگے جھک کر کہتا ہوں۔

"نوجوان!" وہ مجھ سے کہتا ہے "میری عمر بتیس سال ہے۔ میرے خیال سے بتیس سال کے آدمی کو انکل کہہ کر مخاطب نہیں کرتے۔"

میں معذرت چاہتا ہوں اور تصور میں اس کی جگہ خود کو دیکھتا ہوں۔ ریڑھ کی ہڈی سے کوئی چیز سرعت سے نکل گئی ہے۔ میں سر جھٹک کر سوچتا ہوں، دیکھا جائے گا۔ پیٹ میں دو لقمے تو جائیں۔

پیٹ میں دو لقمے جاتے ہیں اور آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ میری ماں میری شادی کے خواب دیکھتی ہے۔ میرے باپ کو خاندان کا نام باقی رکھنے کی فکر ہے۔ لیکن اس نام میں ایسی کیا بات ہے جو اسے باقی رکھا جائے؟ میں ملازمت سے پہلے کی بدحالی کی طرف نہیں لوٹنا چاہتا۔ فیملی پلاننگ والے دو یا تین کی تاکید کرتے

ہیں۔ یہاں ایک کی بھی گنجائش نہیں۔ میں منی اسکرٹ میں ملبوس ٹائپسٹ کی ٹانگوں میں اُلجھا ہوا کھچا کھچ بھرے ہوئے ریل کے تیسرے درجے میں ایک گھنٹہ کھڑے کھڑے ہوئے سفر کرتے ہوئے گھر پہنچتا ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاتا ہوں، دوستوں میں آکر فحش لطیفے بیان کرتا ہوں۔ میرے دوست کہتے ہیں۔ یار تم سے زیادہ زندہ دل آدمی نہیں دیکھا۔

میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل رہا ہوں۔ کوئی میرا نام لے کر پکارتا ہے۔ میں پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ ارے بنرجی تم۔ آؤ یار پہچانتے ہی نہیں جاتے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ میں اس کے گھر چلوں۔ آؤ یار یہیں دو منٹ کے فاصلے پر میرا گھر ہے۔ وہ بہت شاندار کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ بدن بھی فربہ ہو گیا ہے۔ توند نکل آئی ہے۔ میں اس سے مرعوب ہو جاتا ہوں اور دل ہی دل میں اس کا شکر گذار ہوتا ہوں کہ اتنے اخلاق اور رغبت سے مل رہا ہے۔ مختصر سے تین کمروں کے فلیٹ میں جو جدید فرنیچر سے لیس ہے۔ ہم داخل ہوتے ہیں۔ ایک گوشے میں بیٹھی ایک صوفے میں اپنے آپ کو دھنسا دیتا ہوں۔ وہ اپنی بیوی سے ملاتا ہے۔ بھئی یہ ہیں میرے دوست۔ اسکول میں ہمیں ہمیشہ ان پر رشک آتا رہا۔ ہر مضمون میں آگے۔ فٹ بال ٹیم کے کیپٹن۔ یاروں کے یار۔ اس کی بیوی مسکرا کر نمستے کرتی ہے۔ میں بھی ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ تمام ساز و سامان میں میاں بیوی اپنے فربہ جسموں کی وجہ سے کچھ غیر موزوں نظر آتے ہیں۔ میں تصور میں ان دونوں کے بجائے ٹائپسٹ کو اور اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ سامنے رکھی ہوئی چیز دان میں سے کچھ چیزیں چکھتا ہوں اور نہ معلوم کیا باتیں کرنے کے بعد رخصت ہوتا ہوں۔

"ملتے رہا کرو یار۔ تم تو ایسے بدل گئے ہو۔ پہچانے ہی نہیں جاتے۔" وہ مجھ سے کہتا ہے۔ میری اس کی نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ کیا اسے مجھ پر رحم آرہا ہے؟ باہر آکر میرا احساس کمتری اور بڑھ جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ شاید وہ بتلانا چاہتا تھا۔" او کیڑے! دیکھ زندگی اسے کہتے ہیں۔"

گھر پہنچتا ہوں۔ ماں کہتی ہے "بیٹا دیر کیوں ہو گئی۔ ہم تو گھبرا گئے تھے۔ کہیں

کچھ ہونہ گیا ہو۔،، میں سوچتا ہوں۔ کیا واقعی کچھ نہیں ہوا۔ جلد جلد کھانا زہر مار کر کے باہر آتا ہوں۔ دوستوں کو ہنساتے ہنساتے بے حال کر دیتا ہوں۔ یار آج تو تمہارا موڈ بہت شاندار ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا۔ میں مسکرا کر ایک اور لطیفہ بیان کرنے لگتا ہوں۔

" زمانہ کدھر جا رہا ہے ؟" "مسلمان ہندوستانیت کو اپنائیں ـــــ

یہ سرخیاں دیکھ کر میں ایرانی کے ہوٹل میں اخبار پٹک کر سنگین عمارت کے پتھر کے شیروں کو گھورنے چلا جاتا ہوں۔ کیا ان کے جاگنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ شیر یونہی بے حس بے نور آنکھوں سے سامنے تکتے رہتے ہیں۔

آفس کا ماحول اب سدھرتا جا رہا ہے۔ بے رحم وقت نے ٹائپسٹ کے جسم پر بھی اپنا سایہ ڈال دیا ہے۔ اب اس کو دیکھ کر لوگوں کی بیٹھے ہوئے کتوں جیسی حالت نہیں ہوتی۔ باس بھی اب اس کی غلطیاں نکالنے لگا ہے۔ کچھ چڑچڑا بھی ہو گیا ہے۔ اب ماحول کچھ قابل برداشت ہو گیا ہے ـــ ٹائپسٹ اب سب سے بات کرتی ہے منی اسکرٹ پہننا البتہ اُس نے چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ ساری پہننے لگی ہے۔ سینئر کلرک اس پر اب بہت مہربان ہے۔ اس نے اس کے کردار کے متعلق نخش باتیں کرنا چھوڑ دی ہیں بلکہ یوں بھی اب وہ مجھ سے کم ہی بات کرتا ہے۔

" تمہارا کیا خیال ہے سنگھ، اب حالات ٹھیک ہیں نا ؟" میں اُس سے پوچھتا ہوں۔

"اپنے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔،، سنگھ بیزاری سے کہتا ہے۔

"کیا واقعی تم کو سیاست سے دل چسپی نہیں رہی ؟،، میں حیرت سے پوچھتا ہوں۔

"لیکن شاید میرے مسائل ابھی حل نہیں ہوئے،، وہ مایوسی سے کہتا ہے۔

"حل ہے !! حل ہے !! میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔ گویا خود کو تسلی دے رہا ہوں۔ سب میری طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ میں آہستہ آہستہ اپنا حل بتاتا ہوں۔ سب حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہیں اُن کی آنکھیں مسکرا کر کہتی ہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب میری طرح سب سنگین پتھروں کی عمارت کے بے حس بے نور شیروں کے جاگنے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے ایک نہ ایک دن وہ ضرور جاگیں گے۔

★

پُرشور وقت، بے چاپ آوازیں

کمرے میں دبیز اندھیرا ہے اور مکمل سکوت۔ عرفان خود کو بہت ہی ہلکا پھلکا طمانیت کی پرتوں میں لپٹا محسوس کر رہا ہے۔ کیا وقت ہو رہا ہے؟ بیڈ کے سرھانے تپائی پر رکھے ٹیبل لیمپ کے سوئچ کی طرف وہ ہاتھ بڑھاتا ہے مگر سوئچ دباتا نہیں۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا ہے کہ باہر کافی اُجالا ہے جو کھڑکی کا پردہ اُٹھاتے ہی کمرے میں در آئے گا۔ ٹیبل لیمپ کا سوئچ دبانے کے بجائے وہ ٹیلی فون اُٹھا لیتا ہے اور گود میں رکھ کر نمبر گھمانے لگتا ہے۔

"ہلو، میں عرفان بول رہا ہوں۔"

"عرفان، کوئی خاص بات۔"

"نہیں بس یونہی، تمہیں فون کرنے کو جی چاہا۔"

"سویرے سویرے!"

"ہاں یار، سوچا کسی نہ کسی مقصد کے لیے تو ہم فون کرتے رہتے ہیں کبھی خواہ مخواہ بھی گفتگو ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے۔"

"لیکن یار، تمھیں معلوم ہے میں آٹھ بجے سے پہلے اُٹھتا نہیں۔ نیند خراب کردی تم نے، میں تو سوتا ہوں۔"

"سنو تو۔"

فون دوسری طرف سے منقطع ہو چکا تھا۔ عرفان ریسیور پر انگلیاں بجانے لگا۔ کچھ دیر بعد اُس نے دوسرا نمبر لگایا۔

"ہلو، کون؟" ایک نسوانی آواز۔

"میں، عرفان۔"

"اوہ عرفان، کوئی خاص پروگرام؟"

"نہیں بس ایسے ہی، تمہاری یاد آئی۔"

"اوہ! لیکن ابھی مجھے نہانا ہے، ناشتہ کرنا، کالج کے لیے تیار ہونا ہے۔ دوپہر کا لیکچر تو طے ہے نا؟"

"ہاں لیکن سنو تو، اِس وقت میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

"کیسی باتیں۔"

"بس یونہی، کچھ بے مقصد، بے معنی سی باتیں۔"

"وہ تو تم ہمیشہ کرتے ہو۔"

"آں!" عرفان چونکا "کیا کہا تم نے؟"

دوسری طرف سے مترنم ہنسی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ لیکن ڈیر مجھے دیر ہو رہی ہے۔ کالج آ رہے ہو نا، کالج میں باتیں ہوں گی۔"

فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عرفان ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔ بے مقصد، بے معنی سی باتیں، وہ تو تم ہمیشہ کرتے ہو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔

اُس نے پھر نمبر لگایا۔

"یار ظفر میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"بس یار جی چاہ رہا ہے کچھ یونہی سی گفتگو ہو۔ بے مقصد، بے معنی سی۔"

"کچھ پیسے چاہییں؟"

"نہیں یار۔"

"تو پھر کوئی گمبھیر معاملہ ہے۔"

"نہیں بھئی۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"یار میں تو بس یونہی کچھ فضول، بے معنی سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا، کوئی بات بے معنی نہیں ہوتی۔"

"کوئی بات بے معنی نہیں ہوتی؟ وہ کیسے؟"

"یہ تو کامن سینس ہے، کوئی لفظ بغیر مقصد کے زبان پر نہیں آتا۔ ہر بات کا کچھ نہ کچھ مطلب ضرور ہوتا ہے۔ تم تو جانتے ہو بظاہر مہمل سے مہمل کلمے کے بھی آج کل مفہوم نکال لیے جاتے ہیں۔"

"تو تمھیں یقین ہے کہ کوئی لفظ بے معنی نہیں ہوتا۔؟"

"بالکل یقین نہ آئے تو پروفیسر شرون کمار سے پوچھ لو۔"

"اچھا اجازت دو اب مجھے تم۔"

فون پھر منقطع ہو گیا۔

سورج کی کرنیں پردے کو چیر کر کمرے میں داخل ہونے لگیں تو اس نے سوچا کہ منھ دھونا چاہیے۔ لیکن وہ کھڑکی میں آکھڑا ہوا اور پردہ ہٹایا۔ پردہ کھنچتے ہی وہ روشنی میں نہا گیا۔ اپنے بارہویں منزل کے فلیٹ سے اس نے نیچے دیکھا۔ آدمی مختصر سے نظر آرہے تھے۔ ٹریفک رواں دواں تھا۔ لیکن شور اوپر تک نہیں پہنچتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے محسوس کیا۔ جیسے وہ No Man's Land میں ہو۔ ہر طرف ارتعاش تھا، صرف اس کے کمرے میں سکوت تھا۔

وہ پھر فون کے قریب آیا۔

"ہلو پروفیسر صاحب، میں عرفان بول رہا ہوں۔"

"عرفان! کون عرفان؟ اوہ عرفان! اچھا اچھا کیا بات ہے۔"

"دراصل میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہر لفظ جو ہمارے منہ سے نکلتا ہے اس کا مفہوم ضرور ہوتا ہے۔"

"اچھا۔" ہنسنے کی آواز۔ "بھئی صبح صبح، تمھیں یہ کیا سوجھی۔ یہ ٹیلی فون کمپنی نے ٹیلی فون بھی خوب بنایا ہے کیوں جی۔ جب لہر آئی نمبر گھما دیا۔"

"جی تکلیف دہی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کو اس نامناسب وقت پر فون کرنے کی بدتمیزی پر شرمندہ ہوں۔ لیکن میں واقعی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ہر بات کا مفہوم ہوتا ہے۔"

"بالکل ہوتے ہیں جی۔" پروفیسر شرون کمار کی جھلائی ہوئی آواز کے ساتھ ہی ٹیلیفون منقطع ہو گیا۔

عرفان ریسیور رکھ کر پھر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ شاید یہ لوگ میری بات سمجھ نہیں پا رہے یا میں سمجھا نہیں سکتا۔ وہ ایک نظر سامنے پھیلے پھیلے ہوئے اونچی اونچی عمارتوں کے سلسلے کو دیکھتا ہے۔ پھر نیچے سے گزرتے آدمیوں کے ہجوم کو۔ کیا کوئی بھی میری بات سمجھ نہیں سکتا۔

وہ پھر فون پر آیا۔

"ہلو۔"

"میں عرفان۔"

"عرفان، کون عرفان؟ میں کسی عرفان کو نہیں جانتا۔ آپ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔؟"

"میں نے آپ ہی کو فون کیا ہے۔"

"لیکن میں تو آپ کو نہیں جانتا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کیا چاہتے ہیں آپ؟"
"یونہی کچھ باتیں کرنی تھیں آپ سے۔"
"کیسی باتیں؟"
"بس ایسی ہی بے معنی سی۔"
"نان سینس۔"
فون منقطع ہو گیا۔
عرفان نے دوسرا نمبر گھمایا۔
"ہلو، چاندی کا بھاؤ بڑھ رہا ہے۔"
"میں عرفان بول رہا ہوں۔"
"کون عرفان؟"
"میں — ایک کالج اسٹوڈنٹ۔"
"کیا چاہیے آپ کو؟"
"یونہی کچھ فضول سی باتیں کرنی تھیں۔"
"معاف کیجیے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔"
عرفان دوسرا نمبر لگاتا ہے۔
"سائیکلوجسٹ مہتہ اسپیکنگ۔"
"اوہ گڈ لک، مسٹر مہتہ، میں عرفان بول رہا ہوں۔"
"کون عرفان؟"
"ایک کالج اسٹوڈنٹ۔"
"کیا چاہتے ہیں آپ؟"
"آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔"
"مشورہ روم پر تشریف لائیے۔ آج تو میں بالکل انگیج ہوں۔ ہاں پرسوں شام آٹھ کا وقت خالی ہے۔ مناسب ہوگا۔ فیس تو آپ کو معلوم ہوگی

مشورہ فیس پچاس روپے اور پندرہ روپے فی نشست ۔"

" آپ اطمینان رکھیں فیس میں بھجوادوں گا ۔ اس وقت تو مجھے صرف اتنا جاننا ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہر لفظ کا مفہوم ہوتا ہے ۔"

" جی ہاں ! صرف لفظ ہی نہیں بلکہ ہماری ہر حرکت سے کوئی نہ کوئی مفہوم نکالا جا سکتا ہے ۔"

" پھر مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ کچھ باتوں کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا اور وہ اہم ہوتی ہیں ۔"

" دیکھیے جناب کیا نام بتایا آپ نے عرفان ۔ تو عرفان صاحب اس طرح ٹیلیفون پر تفصیل سے بات چیت ممکن نہیں۔ آپ میرے روم پر آئیے ۔ آپ کی پچھلی ہسٹری جان کر اور چند نشستوں کے بعد ہی آپ کی دشواریوں کو حل کر سکوں گا ۔"

" میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ایسا واقعی ہے یا نہیں کہ کچھ باتوں کا ... ."

فون منقطع ہو گیا ۔

عرفان کو اب غصّہ آنے لگا تھا ۔ اُس نے جھنّلا کر دوسرا نمبر ڈائل کیا ۔

" ہلو، میں عرفان بول رہا ہوں ۔"

" کون چاہیے آپ کو ؟"

" آپ ۔"

" آپ کون ؟"

" آپ یعنی آپ ۔"

دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا ۔

" کون چاہیے آپ کو ۔"

" آپ ۔"

"آپ کون؟"

"آپ۔"

فون منقطع

"ہلو۔"

"میں بول رہا ہوں۔"

"میں کون؟"

"میں میں۔"

فون منقطع

عرفان نظروں سے کچھ دیر ٹیلی فون کو تھپکتا رہا۔ پھر اُس نے ٹیلی فون کمپنی کو فون کیا۔

"آپریٹر، کیا میں مینجر سے بات کر سکتا ہوں۔"

آپریٹر نے مینجر سے فون ملا دیا۔

"میں عرفان بول رہا ہوں۔"

"فرمائیے کیا چاہیے آپ کو۔"

"میرا فون مجھے دوسروں سے گفتگو کرنے میں مدد نہیں دے رہا ہے۔"

"آواز صاف نہیں آتی؟"

"آواز تو صاف آتی ہے۔"

"آواز باریک آتی ہے۔"

"جی نہیں۔"

"تو شاید کچھ ڈسٹربنس Disturbance ہوتا ہوگا۔"

"جی نہیں، اور تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں وہ مخاطب کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

ہلکے سے قہقہے کی آواز۔
"جناب اِس میں ٹیلی فون کا کیا قصور ہے۔ اس کا کام تو صرف آواز پہنچا دینا ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی ایسا کیوں ہوتا ہے؟"
"میں کیا بتا سکتا ہوں۔"
عرفان نے ریسیور رکھ کر نوکر کو پکارا۔
"جی چھوٹے صاحب!" نوکر آیا۔
"یہ ٹیلی فون یہاں سے ہٹا دو۔"
"جی۔" نوکر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جیسے کچھ اور بھی سُننے کا منتظر ہو۔
"یہ بات چیت کے لیے کارآمد نہیں۔" عرفان نے بیزار لہجے میں کہا۔ اور باتھ روم چلا گیا۔

اسیرِ زیست

میں نے دل چسپی سے اس لڑکی کو اس کی ماں کے ساتھ اپنی دوکان پر چڑھتے دیکھا۔ وہ کالا برقع پہنے ہوئے تھی۔ نقاب چہرے سے اٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے یہاں دوکان کھولی تھی وہ بہ مشکل پانچ سال کی ہوگی۔ تب سے میں اُسے دیکھتا آیا تھا گوری چٹی، سرخ سرخ، دوکان کے سامنے بس اسٹاپ پہ اسکول جانے کے لیے کھڑی رہتی۔ اس کے چہرے پر میں نے ہمیشہ ایک دبا دبا سا جوش دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے وجود کا ذرہ ذرہ حرکت کے لیے بے تاب ہے۔ میں اُسے تقریباً تین سال بعد دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اسکول کی تعلیم ختم کر چکی تھی۔ اسی لیے وہ بس اسٹاپ پر نظر نہیں آتی تھی۔ تین سال میں وہ اور خوب صورت ہو گئی تھی۔

"ہمیں رخشانہ کا فوٹو کھنچوانا ہے۔" لڑکی کی عمر رسیدہ ماں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ورنہ فوٹو گرافر کی دوکان میں قدم رکھنے کی آپ زحمت کیوں کرتیں۔"

رخشانہ مسکرادی۔

"کس سائز کی فوٹو کھنچوائیں گی آپ؟" میں نے پوچھا۔

میں نے دو تین سائز کے فوٹو انھیں دکھائے۔ انھوں نے کیبنٹ سائز کا انتخاب

گیا۔ میں انہیں اندر کے کمرے میں لے گیا۔

رخسانہ کو اسٹول پر بیٹھنے کے لیے کہہ کر میں نے کیمرے کے لینس برابر کیے۔ بتیاں جلاکر اطمینان کر لینے کے بعد میں نے اُس سے ٹھوڑی ذرا اوپر اُٹھانے کے لیے کہا۔ چہرے پر تناؤ نہ لانے کی ہدایت کی اور دوبارہ کیمرے میں جھانکا۔

"شادی کے لیے کھنچوا رہے ہیں۔ خوب اچھی سی کھینچو"، لڑکی کی ماں نے جو میرے پیچھے کھڑی تھی، میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں مُسکرا کر رہ گیا۔

دو روز بعد اس کی ماں تصویریں لے گئی۔ ایک کاپی میں نے الماری میں سجادی۔ کئی مہینوں بعد میں نے لڑکی کی ماں کو اپنی دوکان کے سامنے سے گزرتے دیکھا تو اس سے پوچھا کیا لڑکی کی شادی ہوگئی؟

"نہیں میاں، لڑکے والے تو ایک ٹانگ پر راضی تھے۔ لڑکی کا بھائی مرا جا رہا ہے کہ لڑکی کی شادی نہ ہو۔ اس نے لڑکا ناپسند کردیا۔ کئی پیغام آئے۔ پر مُوا ہر ایک میں مین میخ نکالے ہے۔" اُس کی ماں نے کہا۔

"کیوں، وہ کیوں نہیں چاہتا۔" میں نے پوچھا۔

"جہیز دینا پڑے گا اور کیا، شادی کا خرچ بھی اٹھانا ہوگا۔" رخسانہ کی ماں نے کہا۔

مجھے افسوس ہوا۔

سات آٹھ سال بعد ایک شادی کی تقریب میں تصویریں لینے گیا تو میں نے دیکھا۔ رخسانہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ لڑکی کی ماں نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اور خوشی کا اظہار کیا۔ اُس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھی جلد ہی معلوم ہوگئی۔ دولہا جو بعد میں معلوم ہوا کسی شہر کے کالج میں لیکچرار ہے تقریباً پینتالیس سال کا نظر آتا تھا۔ سنجیدہ متین چہرے مہرے سے خاندانی وجاہت ٹپکتی تھی۔ مجھے بھی افسوس ہوا اس لیے نہیں کہ دولہے کی عمر بہت زیادہ تھی بلکہ اس لیے کہ کہیں لڑکے کی سنجیدہ مزاجی کا سایہ لڑکی پر نہ پڑ جائے۔

میں نے کئی تصویریں کھینچیں۔ اچھا خاصہ ہنگامہ تھا۔ شادی تمام لوازمات کے ساتھ ہوئی۔ دولہے کو زنانے میں لے جایا گیا۔ وہاں تصویریں لینے کے لیے مجھے عورتوں کے درمیان

کھڑا رہنا پڑا۔

"دولہے کی عمر تو زیادہ لگتی ہے۔" کوئی عورت کہہ رہی تھی۔

"ہاں چالیس بینتالیس سال سے کم نہ ہوگا۔" کسی عورت نے کہا۔

"سنتے ہیں لڑکی کا بھائی کئی پیغام ناپسند کرچکا تھا۔ اب کیسے راضی ہوگیا۔" کسی نے پوچھا

"کہتے ہیں دولہے میاں اسے کوئی دوکان کروا رہے ہیں۔"

"اچھا! جبھی تو۔"

شادی کے بعد وہ کئی بار مجھے اپنے شوہر کے ساتھ نظر آئی۔ کچھ سنجیدہ، خاموش، دبی دبی سی۔ لیکن شوہر کی طرف دیکھتی تو دلی محبت آنکھوں سے ظاہر ہوتی۔ پھر کئی برس وہ مجھے نظر نہ آئی۔ میری عمر زیادہ ہوچکی تھی۔ طبیعت اکثر ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ دوکان بند کردوں۔ لیکن کچھ نہ کرنے کا خیال بھی میرے لیے جان لیوا تھا۔ شادی میں نے نہیں کی تھی۔ گھریلو بکھیڑے پالنے سے میری طبیعت اُلجھتی تھی۔ لیکن اب تنہائی سوہانِ روح ہوتی جارہی تھی۔ دوکان کے اوقات کا بھی میں پابند نہیں رہا تھا۔ جب جی گھبراتا دوکان بند کردیتا۔

ایک دن طبیعت پژمردہ تھی۔ میں دوکان بند کرکے جانے کی سوچ رہا تھا کہ رخسانہ کے شوہر کو ایک چار سالہ بچی کے ساتھ دوکان پر چڑھتے دیکھا۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔" وہ یہ کہہ کر مسکرائے۔

"کیوں نہیں، آپ کی شادی کی تصویریں میں نے ہی اُتاری تھیں۔" میں نے کہا۔

"باوجود اتنی عمر کے آپ کی یادداشت قابلِ تعریف ہے۔" انھوں نے چشمہ آنکھ سے اُتار کر صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اس بچی کی تصویریں اُتارنی تھیں۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ رخسانہ کیسی ہے لیکن مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اس دوران بچی دوکان کی مختلف چیزیں اُلٹ پلٹ کررہی تھی۔

"نہیں بے بی" انھوں نے پیار سے منع کیا۔

"آؤ بے بی، تمہاری تصویریں اُتاریں۔" میں نے کہا۔

ہم اندر کے کمرے میں چلے آئے۔

کیمرے کا اسٹینڈ میں نے کونے سے اُٹھا کر اسٹول کے سامنے رکھا۔ پھر اسٹول کو کیمرے کے قریب کر رہا تھا کہ آواز سُن کر چونک گیا۔ بچّی نے بلب کا اسٹینڈ گرا دیا تھا۔ بلب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

میں نے رخسانہ کے شوہر کی طرف دیکھا۔ اُن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ بچّی بھی گھبرا گئی۔

"کوئی بات نہیں بے بی۔" میں مسکراتے ہوئے اُس کے قریب گیا اور پیار سے اُس کے گال تھپتھپائے۔

"آؤ بے بی، اسٹول پر بیٹھو۔" میں نے اُسے اُٹھا کر اسٹول پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

اسٹینڈ سیدھا کر کے میں نے الماری سے بلب نکال کر لگایا۔ تصویر اُتاری۔

باہر آتے ہوئے انھوں نے بلب کے نقصان پر معذرت چاہی اور پیسے دینے چاہے۔

"نہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "بچّوں سے کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"شکریہ آپ واقعی بہت اچھے آدمی ہیں۔ پھر بھی آپ پیسے لے لیں تو بہتر ہے۔"

"آپ کیوں خواہ مخواہ نقصان اُٹھائیں۔" اُنھوں نے کہا۔

میں نے پیسے نہیں لیے۔

"تو پھر میں کب آؤں؟" انھوں نے پوچھا۔

"پرسوں کسی کو بھیج دیجیے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں شاید میں خود ہی آؤں۔ آپ سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔" انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا اور بچی کی انگلی پکڑے جانے لگے۔ جاتے جاتے وہ یونہی سرسری نظروں سے دوکان میں لگی تصویریں دیکھتے جا رہے تھے کہ ایک تصویر دیکھ کر

رُک گئے۔ یہ رخسانہ کی تصویر تھی۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ دوکان میں آئی تھی۔

"یہ تصویر۔۔۔۔" انھوں نے تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"یہ آپ کی بیوی کی تصویر ہے۔" میں نے کہا۔ "پندرہ سولہ سال پہلے لی ہوئی۔"

"انہی کی طرح معلوم ہوئی، اس لیے میں بھی چونک گیا تھا" انھوں نے کہا۔

"لیکن میں نے اپنی بیوی کے پاس یہ تصویر کبھی نہیں دیکھی۔"

"شاید اس کی ماں کے گھر ہو۔" میں نے کہا۔ "انہی کے ساتھ آ کر انھوں نے یہ تصویر کھنچوائی تھی۔"

"ان کی ماں کو تو گزرے اب کئی سال ہو گئے۔" انھوں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے آپ کی بیوی کے پاس ہو، اُن سے پوچھیے گا۔" میں نے کہا۔

اُن کا چہرہ دھندلا سا گیا۔ قریب رکھی کرسی پر وہ گر سے گئے۔

"شاید آپ کو پتہ نہیں، ایک سال پہلے وہ انتقال کر گئیں۔" انھوں نے کہا۔

"اوہ۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے وہ بڑی اچھی خاتون تھیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے اُن کا ذکر کر کے آپ کو افسردہ کر دیا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔"

"اب کیا بتاؤں" انھوں نے کہا۔

کچھ دیر وہ اپنی طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر یکایک کہنے لگے۔

"آپ اِس بچی کے ساتھ جس پیار سے پیش آئے، میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس بچی کو کبھی نہیں ڈانٹتا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں ایک اچھا باپ نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں یہ رخسانہ کی نشانی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ شادی کے وقت میری عمر رخسانہ سے بہت زیادہ تھی۔ میں اکثر اس پر غصہ ہو جاتا تھا۔ مجھے خیال رہتا کہ وہ کم سنی کے باعث کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جو ہمارے خاندان کو بٹہ لگا دے۔ آج پشیمانی ہوتی ہے۔ لیکن اُس وقت میں ایسے ہی سوچتا تھا۔ ہم دونوں میں ہمیشہ ایک فاصلہ رہا۔ اس نے مجھے اتنی محبت دی، اتنی محبت دی۔ لیکن میں اپنی طرف سے کبھی فاصلوں کو کم نہ کر سکا۔ سوائے آخری چند دنوں کے۔

وہ کہتے کہتے رُک گئے۔ مجھے اُن کی باتیں سُن کر تعجب سا ہو رہا تھا۔
آپ سوچ رہے ہوں گے،، انھوں نے کچھ دیر رُک کر بولنا شروع کیا۔"میں آپ سے یہ سب باتیں کیوں کہہ رہا ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنوں سے کہنا بہت دشوار ہوتا ہے۔،،

وہ زمین کو تکتے ہوئے جیسے خود سے باتیں کرنے لگے۔

"میرے نہ چاہنے کے باوجود وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ دوسرے بچے کی پیدائش میں کچھ مہینے باقی تھے۔ دو تین روز ہی میں، میں جو اُس کے وجود کا عادی ہو گیا تھا۔ گھبرا گیا سلاتعداد چھوٹے چھوٹے کام جو وہ پتہ نہیں کب کر ڈالتی تھی۔ مجھے جھنجھلانے لگے۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں بے اختیار ہو گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اُسے بے حد چاہتا ہوں۔ پاگلوں کی طرح بے چین میں سیدھے اس کے گھر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔

"آپ،، کہتی ہوئی وہ قریب قریب دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس لمحے پہلی بار ہمارے درمیان کے تمام فاصلے ختم ہو گئے۔ تب مجھے معلوم ہوا اس میں زندگی کی کیسی چاہت، کیسی تڑپ تھی۔ ہم پارکوں میں، دریا کنارے یا تفریح گاہوں پر چلے جاتے۔ راستوں پر کھڑے رہ کر ہم نے چاٹ اور اس قسم کی چیزیں کھائیں جو شاید اپنے خواب میں مجھ سے کبھی ممکن نہ تھا۔ بچوں جیسی ہم نے نہ جانے کتنی ہی حرکتیں کیں۔ وہی چند لمحے شاید میں رخسانہ کی زندگی میں کچھ مسرتیں بکھیر سکا۔ کاش وہ دوسری زچگی میں مر نہ جاتی۔ میں اس کے دامن میں اتنی خوشیاں بھر دیتا، اتنی خوشیاں بھر دیتا کہ تمام عمر کا کفارہ ادا ہو جاتا۔،،

وہ جذبات سے گلوگیر ہو کر اُٹھ گئے۔

"اب چاہتا ہوں، اس بچی کی کسی خوشی میں مخل نہ ہوں۔ یہ آخر اُسی کی تو لڑکی ہے۔ شاید زندگی سے لطف اندوز ہونے کی اس میں بھی اتنی ہی تڑپ ہو۔،،

دو روز بعد میں نے رخسانہ کی تصویر نکال کر اس کے شوہر کو دی اور اس جگہ بچی کی تصویر لگا دی۔

سیاہ اور سفید

چڑیوں کے شور اور دھوپ کی تمازت سے پریشان ہو کر وہ اُٹھا تو سورج اس کی کھڑکی کے سامنے تھا۔ دھان کے کھیت دور دور تک لہلہاتے نظر آ رہے تھے۔ دُور نیلگوں فلک دھان کی سنہری بالیوں کو چھو رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر منہ دھویا۔ اُس کی چچا زاد بہن نے ناشتہ لگا دیا۔ جلیبی دیکھ کر وہ چونک گیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ آج وہ ملازمت کی تلاش میں بمبئی جا رہا ہے۔ روٹی حلق میں پھنسنے لگی۔ اُسے احساس ہوا کہ گھر میں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ وہ اُٹھ گیا۔

اُس کی ماں نے اُس کی پیشانی چومی اور اُس کا سر اپنے کندھے پر لیئے کچھ پڑھتی رہیں اور روتی رہیں۔ بمبئی پہنچتے ہی خط لکھنا۔ انھوں نے اس سے اصرار کیا۔ اور ایک سو بتیس روپے اس کی جیب میں رکھ دیئے۔ جو پتہ نہیں کب سے وہ رکھے ہوئے تھیں۔

گاؤں سے اسٹیشن دو میل دور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چچا کے علاوہ گاؤں کے دو تین بڑے بوڑھے اور ساتھ کے لنگوٹیاں تھے۔ سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔

وہ گاڑی میں بیٹھا تو بڑے بوڑھوں نے خط لکھنے کی تاکید کی اور اُس سے کہا کہ سال چھ مہینے میں گاؤں ضرور آیا کرے۔

گاڑی چلی تو چچا نے کہا "بھائی کی آخری نشانی بھی آج آنکھوں سے دُور

ہو رہی ہے اور آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ ساتھیوں کے گالوں پر آنسو چمکتے نظر آئے گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑا تو اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اُس نے سسکی لی اور بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔

راستے بھر ماں کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ اسٹیشن آتے رہے اور جاتے رہے لیکن وہ اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو وہ اُتر پڑا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ اُس نے کئی ہوٹل دیکھے۔ لیکن کوئی ہوٹل آٹھ روپے روز سے کم کا نہ تھا۔ اُسے پتہ نہیں کب کام ملے اور اب وہ گھر سے پیسے منگوانا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ چچا نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ جب بھی اسے پیسوں کی یا کسی چیز کی ضرورت ہو اسے لکھے۔

اس نے ایک جگہ رُک کر پان خریدا اور پان کھاتے ہوئے پان والے سے اپنی دشواری بیان کی۔

"یہیں فٹ پاتھ پر سو جاؤ۔" اُس نے کہا۔

"کیا؟" اُسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

"یہیں فٹ پاتھ پر سو جاؤ، ہزاروں لوگ سوتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "آٹھ دس دن میں پیسے ختم ہو جائیں گے پھر کیا کرو گے؟"

"تب تک کہیں نہ کہیں کام مل جائے گا۔" اُس نے کہا۔

پان والا ہنسنے لگا۔ "کوئی کھیل ہے کیا؟" اُس نے کہا۔ "تم تو پڑھے لکھے جان پڑتے ہو۔ پڑھے لکھوں کو تو کام ملنا اور زیادہ مشکل ہے۔"

وہ سوچنے لگا۔ کیا کرے۔ پان والے ہی کی بات ٹھیک معلوم ہوئی۔ لیکن صندوق وہ کہاں رکھے۔ اُس نے پان والے سے کہا۔

"بہت سامان ہے کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں صرف چار جوڑے کپڑے اور کچھ کتابیں ہیں۔"

"تو وہیں سرہانے رکھ لو۔"

وہ صندوق فٹ پاتھ پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اگرچہ کچھ عجیب سا لگا۔ بمبئی آتے ہی چند گھنٹوں میں اس حالت کو پہنچنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔

فٹ پاتھ پر کافی بھیڑ تھی۔ اگرچہ رات کے نو بجے تھے۔ اُسے خیال آیا کہ اس کے گاؤں میں تو لوگ اب تک سو جاتے ہیں لیکن یہاں تو جیسے وقت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ دس بجے کے قریب بھیڑ کچھ کم ہوئی اور چار آدمیوں نے آکر بستر بچھایا۔ تو وہ بھی بستر لگانے لگا۔

"اے بھائی! اُدھر دوسرے لوگ بستر لگاتے ہیں، آپ ذرا ہٹ کر اپنا بستر بچھائیں۔" اُس نے تھوڑا ہٹ کر بستر لگایا اور لیٹ گیا۔ زندگی میں پہلی بار سڑک پر سونے کا اتفاق ہوا تھا۔ سڑک کی روشنیاں آنکھوں میں چبھنے لگی۔ آس پاس کی عمارتوں کے چند کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ اسے روشنی میں سونے کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ بڑی دیر تک کروٹ بدلتا رہا۔ سر پر کھلا سیاہ آسمان تھا۔ تارے اکا دُکا چمک رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرتی لاریوں اور موٹروں کی آوازیں سونا اور بھی دشوار کر رہی تھیں۔ گاڑیاں موڑ پر گھومتے ہوئے روشنیاں چمکاتیں اور اُس کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ اُسے اپنے گاؤں کے بڑے بڑے کمرے، دالان یاد آگئے آرام دہ بستر یاد آیا۔ اور فٹ پاتھ کی سخت زمین بے تحاشا چبھنے لگی۔ اُس نے آس پاس دیکھا۔ بہت سے لوگ سو چکے تھے۔ کیا اُسے بھی اس طرح سونے کی عادت ہو جائے گی؟ کاش اُسے جلد ہی ملازمت مل جائے اور وہ کمرہ لے کر وہاں منتقل ہو سکے۔

صبح پان والے نے اُٹھایا۔

"اُٹھو بابو ساڑھے سات بج رہے ہیں۔" پان والے نے اُس سے کہا۔ "آج پہلا دن تھا۔ ہم نے سوچا سونے دو، رات نیند دیر میں آئی ہوگی کب سوئے؟"

"پتہ نہیں، ایک یا دو تو بج ہی گئے ہوں گے۔"

اُس کے قریب سوئے ہوئے لوگ، صبح کے اُجالے میں کھو گئے تھے۔ اُس کے قریب سے بسیں گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ لوگوں کا ہجوم تھا، جو نقل و حرکت

میں مصروف تھا۔

"سامنے ہوٹل میں جاکر ناشتہ کر لیجیے۔ وہیں منہ ہاتھ بھی دھو لیجیے گا۔" پان والے نے کہا۔

"مجھے دانت بھی مانجھنا ہے۔" اُس نے کہا۔

"تو کیا ہوا وہیں چلے جائیے۔" پان والے نے کہا۔

"یا آئیے میں آپ کو بلڈنگ میں لے چلوں۔"

وہ پان والے کے ساتھ بلڈنگ میں گیا۔ دانت مانجھ کر اُس نے مُنہ ہاتھ دھویا۔ ہوٹل میں جاکر اُس نے ناشتہ کیا۔ وہیں اخبار میں "ضرورت ہے" کے کالم پڑھتے ہوئے اُس نے دو تین پتے نوٹ کیے اور پان والے کے پاس لوٹ آیا۔ صندوق میں سے کچھ کاغذات نکالے۔ عرضیاں لکھیں اور پان والے کے پتے سے بھیج دیں۔ اُس کا جی کچھ ہلکا ہو گیا۔ صندوق پان والے کے پاس رکھ کر وہ چل پڑا۔ خیال تھا شاید بھٹکتے بھٹکتے کہیں کام مل ہی جائے۔

یہ معمول کئی دن تک چلتا رہا۔ پیسے ختم ہونے کے قریب تھے۔ اس نے گھر پر اس دوران دو تین خط لکھے لیکن پیسے نہیں مانگے۔ اگرچہ وہ بہت فکرمند تھا۔

اپنی فٹ پاتھ کے لوگوں کو اب وہ کچھ کچھ پہچاننے لگا تھا۔ گڈو، رشید مل میں اور منوہر کسی کارخانے میں نوکر تھا۔ گڈو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہ رہا تھا۔ رجو جیب کترا تھا۔ اور بہت سے لوگ تھے جنھیں وہ صرف چہروں سے جانتا تھا۔ وہ صرف رات میں سونے کے لیے آتے، صبح چلے جاتے۔ اکثر میلے کچیلے کپڑوں میں زمین پر بغیر دری یا چٹائی بچھائے سو جاتے۔

رجو، گڈو، رشید اور منوہر رات میں دیر تک تاش کھیلتے بیٹھے رہتے۔ وہ انھیں دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھار ان میں کوئی پکچر دیکھنے چلا جاتا یا کہیں اور چلا جاتا۔ یا رجو پکڑ کر جبری طرح پیٹا جاتا تو اسے تاش میں شریک کر لیا جاتا۔ لیکن اُن کا کھردرا لہجہ اور کھری گفتگو اسے بہت کھلتی تھی۔ ان کے ہر تین الفاظ میں ایک گالی ہوتی تھی۔

اکثر بے بات آپس میں لڑ پڑتے۔ کبھی پی کر آتے اور ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے گڈو ہر تیسرے دن پی کر آتا جس پر اُس کی بیوی اسے بے نقط سناتی اور وہ اسے بُری طرح پیٹتا۔ وہ ناچار اُن میں بسر کرتا رہا۔ پیسے ختم ہو رہے تھے اور وہ بھی اس حقیقت کے باوجود کہ پچھلے کئی دنوں سے اُس نے ناشتہ گوار کر دیا تھا۔

ایک رات رشید نے تاش کھیلتے ہوئے اُس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اسے ریفائنری میں کام مل سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اُس نے اُس سے کہا کہ وہ صبح اُسے ریفائنری کے مالک کے پاس لے جائے گا۔ لیکن جب وہ صبح اُٹھا تو رشید جا چکا تھا۔ وہ دو تین دن اصرار کرتا رہا اور رشید ٹالتا رہا۔ ایک رات وہ ذرا جلدی ہی چلا آیا اور اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"رات کے وقت؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں چلو وہ یہیں رہتا ہے۔" رشید نے کہا۔

وہ فوراً قمیص پہن کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ کئی گلیوں میں گھماتے ہوئے ایک تنگ گلی کے باہر جس میں بہ مشکل ایک آدمی گزر سکتا تھا اُس نے اُسے کھڑا کر دیا۔ اور خود گلی میں چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ برآمد ہوا تو اُس کے پیچھے ٹیریلین کی قمیص پہنے، تہمد باندھے ایک کالا آدمی بھی نمودار ہوا۔ اُس کے سیاہ چہرے میں سرکاری قمقموں کی روشنی جذب ہوتی معلوم ہوتی تھی۔

"تم میرے پاس کام کرنا چاہتے ہو؟" اُس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!"

"کیا نام ہے تمہارا؟ اُس نے پوچھا۔

"ریاض۔"

"پڑھے لکھے ہو۔۔؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کہاں تک پڑھے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"الیف۔اے پاس ہوں۔"

وہ رشید کی طرف متوجہ ہوا۔" آدمی تو مضبوط ہے۔جسم وغیرہ اچھا ہے۔خالی گال کچھ اندر دھنس گئے ہیں۔" اُس نے کہا۔" لیکن اس کو ڈبے کا کام دینا بے کار ہے۔"

" تم کو حساب کتاب رکھنا ہوگا۔" اُس نے ریاض سے کہا۔" پولیس والوں سے بات چیت کرنی ہوگی۔دس روپیہ روز ملے گا۔"

" پولیس والوں سے کیوں؟ " اُس نے پوچھا۔

اُس نے کچھ پریشان نظروں سے رشید کی طرف دیکھا۔

"تم نے برابر بتا دیا تھا ان کو؟ " اُس نے رشید سے پوچھا۔

" میں نے کہا تھا ریفائنری کا کام ہے۔" رشید نے بتایا۔

" ذرا آؤ میرے ساتھ" اُس نے ریاض سے کہا۔

وہ تینوں گلی میں گھسے۔کچھ دُور چل کر بدبو کا جھونکا آیا۔آگے بڑھے تو اُسے ناک پر رومال لینا پڑا۔کچھ ڈبے رکھے نظر آئے۔

" یہ کام ہے۔" اُس نے بتایا۔

" یہ تو شاید شراب ہے " اُس نے کہا۔

" ہاں یہی کام ہوتا ہے یہاں۔" اُس سیاہ آدمی نے کہا۔

" انھوں نے ریفائنری کہا تھا۔" اُس نے کہا۔

" یہاں اسے ریفائنری ہی کہتے ہیں۔" سیاہ شخص نے بتایا۔

" تمہیں صرف حساب کتاب رکھنا ہوگا اور پولیس سے بات چیت کرنا۔فکر کی کوئی بات نہیں جب تک میں ہوں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

"سوچوں گا۔" اُس نے کہا۔اُسے خیال آگیا تھا کہ جیب میں صرف تین روپے ہیں۔

اُس رات سب دیر تک اُس کا مذاق اُڑاتے رہے۔اُس نے رشید سے کہہ دیا تھا کہ اُسے کام منظور نہیں۔

"تم سالا ایک دم اناڑی ہے۔" گدّو نے کہا۔

دوسرے دن وہ شہر کے نسبتاً بہتر علاقے سے گزر رہا تھا۔ یہاں اُونچی اُونچی شاندار عمارتیں تھیں۔ فٹ پاتھ بھی یہاں کی اچھی تھی۔ اور صاف ستھری۔ اُس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا دُبلا پتلا آدمی موٹا سا چشمہ پہنے، فٹ پاتھ پر صاف سی دری بچھا کر نیم دراز لیٹے ہوئے اخبار دیکھ رہا ہے۔ اُس نے جب سے بمبئی کا ناشتہ چھوڑا تھا، اخبار نہیں دیکھا تھا۔ کھانے کے اوقات میں ہوٹل میں۔ اس قدر رش ہوتا تھا کہ اخبار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

"میں ذرا اخبار دیکھ سکتا ہوں۔" اُس نے اُس آدمی سے کہا۔

موٹے سے چشمے سے اُس شخص نے کچھ گھُور کر اُسے دیکھا۔ پھر اخبار کے چار صفحات اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ اخبار لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھنے لگا تو وہ شخص تھوڑا سا سرک گیا اور وہ دری پر بیٹھ گیا۔ کافی دنوں کے بعد اخبار پڑھتے ہوئے اُسے خوشی ہوئی۔ اس دوران وہ ایک بار اسے محسوس ہوا کہ چشمے والا شخص اُسے دیکھ رہا ہے لیکن وہ اخبار پڑھتا رہا۔ صفحات ختم کر کے اُس نے اُسے دیکھا تو اُس نے بقیہ صفحات بھی اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ پھر پڑھنے لگا۔ اخبار ختم کر کے اُس نے صفحات لوٹائے اور کہا۔

"شکریہ صاحب، میں چلتا ہوں۔"

"یہ بھی خوب رہی، شکریہ صاحب، میں چلتا ہوں۔" اُس نے کہا۔

وہ کھسیا گیا۔

"مجھے شنکر کہتے ہیں، آپ کی تعریف؟"

"میرا نام ریاض ہے۔"

وہ ایک دوسرے کے متعلق سوالات کرنے لگے۔ اُس نے بتایا کہ گاؤں میں اس کی بوڑھی ماں اُس کے چچا کے گھر رہ رہی ہے۔ اور وہ ملازمت کے سلسلے میں بمبئی آیا ہوا ہے۔

"اپنا تو اس دنیا میں کوئی نہیں۔" اُس نے بتایا۔ "میں سترہ سال پہلے بمبئی آیا تھا۔ ماں باپ کو مرے کئی سال ہو گئے۔ بھائی بہنوں سے بھی الگ ہوں۔ وہ کہاں ہیں، کیا کرتے ہیں، پتہ نہیں۔ میں کبھی گاؤں لوٹ کر گیا نہیں۔ طبیعت ہی نہیں ہوتی۔"

اس رات وہ اپنا صندوق شنکر کی فٹ پاتھ پر لے آیا۔ صندوق دیکھ کر شنکر ہنسا۔

"یہ دنیا داری آلودگی کس لیے بھئی؟" اس نے اُس سے کہا۔ "کیا ہے اس میں؟"

"یہی چار جوڑے کپڑے اور چند کتابیں ———" ریاض نے بتایا۔

"کتابیں؟" "قہ قہ قہ" وہ ہنسا۔ "فری تھنکر، خود سوچیے، خود سمجھیے۔ اپنی دنیا آپ بنائیے۔ مجھے دیکھیے دس سال سے میں نے ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔ صرف اخبار پڑھتا ہوں صرف اخبار۔ قہ قہ قہ۔"

اس فٹ پاتھ کا ماحول اسے بہتر معلوم ہوا۔ ایک اور انٹلکچوئیل اس فٹ پاتھ پر رہتا تھا۔ رابرٹ پریرا۔ وہ ایک کمپنی میں ٹائم کیپر تھا۔ ویسے شنکر بھی ایک کیمرا مل میں کلرک تھا۔

"کمپنی تم لوگوں کو روم نہیں دے سکتی؟" ریاض نے اُن سے پوچھا۔

"ملتے تو ہیں لیکن ہم لینا نہیں چاہتے۔" شنکر نے کہا۔

"کیوں؟" اُس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہم لوگ، اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔" رابرٹ نے کہا۔ کھلی ہوا میں یہاں بغیر کسی تکلیف کے اچھی بھلی زندگی گزار رہے ہیں۔ خواہ مخواہ روم کیوں لیں۔

"تمہیں شادی نہیں کرنی ہے؟" اُس نے رابرٹ سے پوچھا۔

"میں اس قسم کی خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔" رابرٹ نے جواب دیا۔

"بارش میں تو تکلیف ہوتی ہو گی؟"

"بارش میں ہم کسی بلڈنگ کے زینے کے نیچے سو جاتے ہیں۔"

رابرٹ اور شنکر باقاعدگی سے کام پر جاتے، کبھی کبھار پی لیتے، کبھی فلم دیکھنے یا میچ دیکھنے چلے جاتے۔ اُسے بھی اس زندگی میں لطف آنے لگا۔ بالکل آزاد زندگی۔ اُسے کچھ دن اس بات پر کچھ تعجب رہا کہ آس پاس کے لوگ بھی انھیں حقارت سے نہیں دیکھتے تھے۔ نوجوان لڑکے اور شادی شدہ آدمی ان کے ساتھ گھنٹوں ریس کے نتیجوں پر، یا کسی کھیل پر یا زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ان سے ریاض کی بھی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اسے دو چار ٹیوشن مل گئے تھے۔ ٹیوشن دینے آس پاس کی عمارتوں میں جاتا تو کبھی کبھار صاف ستھرے کمرے دیکھ کر اس کے دل میں ان میں رہنے کی خواہش جاگ جاتی۔

دو سال گزر گئے۔ ملازمت تو نہ لگی لیکن ٹیوشنوں سے گزر بسر ہوتی رہی۔ وہ تیس چالیس روپے ماں کو بھیجتا۔ باقی میں کچھ تنگی سے گزارا ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ خوش تھا۔ ایک دن اسے تار آیا کہ اُس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ گاؤں سے اُس کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہوگیا۔ گاؤں والوں نے فاتحہ وغیرہ کے لیے بلایا۔ لیکن اب اس کی طبیعت ہی دوسری ہو چکی تھی وہ گیا نہیں۔

اُس کے دوستوں میں شیام موٹر چلانا سیکھنے لگا تو اس نے اصرار کر کے ریاض کو بھی سیکھنے کے لیے کہا۔ اگرچہ اُس نے کہا بھی کہ وہ ڈرائیونگ سیکھ کے کیا کرے گا۔

"اچھا ہے، ڈرائیونگ سیکھ جاؤ گے۔ تو کہیں ڈرائیور ہو سکتے ہو۔" شیام نے کہا۔ "آج کل ڈرائیوروں کا بڑا ڈیمانڈ ہے۔ پھر ہنر کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے۔"

شیام کے باپ کی اپنی گاڑی تھی۔ ان دونوں کے ڈرائیونگ سیکھنے سے گاڑی کے تو انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ لیکن دونوں بہر حال گاڑی چلانا سیکھ گئے۔ شیام نے اپنے لیے لائسنس نکلوایا اور ریاض کے لیے بھی۔ اگرچہ ریاض نے کچھ زیادہ دلچسپی ظاہر نہ کی۔

ایک دن شیام نے اسے بتایا کہ اس کے والد کے ایک دوست کو ڈرائیور

کی ضرورت ہے۔ اُس نے سوچا ٹیوشن کے ساتھ تھوڑا ڈرائیونگ بھی کرتے رہے تو زندگی اور چین سے گزرے گی۔ وہ دونوں اس کے گھر گئے۔ بڑا شاندار بنگلہ تھا۔ اُس نے ریاض سے اُس کا نام پوچھا۔ اُسے یہ جان کر بہت صدمہ ہوا کہ اس کے ماں باپ ہی نہیں کوئی جذباتی احمق معلوم ہوتا ہے۔ ریاض نے سوچا۔

"آؤ دیکھیں تم گاڑی کیسے چلاتے ہو" اُس نے کہا۔

بڑی شاندار گاڑی تھی۔ ریاض اور ستام گاڑی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ریاض نے گاڑی چلاکر دکھائی۔ شہر کے راستوں سے وہ واقف ہوچکا تھا۔ وہ رئیس آدمی مطمئن ہوگیا۔

"کل صبح سے آجاؤ۔" اُس نے ریاض سے کہا۔

ریاض لوٹنے لگا تو اس نے کہا۔ ہاں اور سنو، سرونٹس کوارٹر میں ایک کھولی خالی ہے۔ تم کل سے یا چاہو تو آج رات سے ہی آجاؤ۔"

اب تو ریاض کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ تھا۔ برسوں کی خواہش آج پوری ہو رہی تھی۔ وہ فوراً بستر لانے چلا گیا۔ شنکر کے زیادہ تر صندوق سے وہ چھٹکارا پا ہی گیا تھا۔

"احمق ہوئے ہو" شنکر کو جیسے ہی اُس نے بتایا، اُس نے کہا۔ کھلی ہوا میں رہنا تمہیں پسند نہیں۔ اس بند جگہ جاکر تمہارے خیالات بھی گھٹ جائیں گے۔"

لیکن ریاض نہیں مانا۔

"جاتے ہو تو جاؤ۔" رابرٹ نے کہا۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ زندگی کی سمجھ تم میں ابھی کچی ہے۔ بہرحال ہم تمہیں روک نہیں سکتے۔"

ریاض نے بستر لپیٹا۔ بنگلے پر آ گیا۔ ایک ملازم نے اسے کھولی دکھائی۔ بڑی صاف ستھری کھولی تھی۔ رنگ و روغن کی ہوئی۔ ریاض نے کھڑکی کھول دی۔ اندر کھاٹ رکھی تھی۔ اس نے اس پر بستر لگا دیا۔ فرش کو جھاڑ دی۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ لیٹ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ گاؤں میں رات میں سوتے ہوئے کچھ یہی کیفیت ہوتی تھی

گاؤں کے مکان کے کمرے البتہ بڑے بڑے تھے۔ سوتے ہوئے چراغ بجھاتے تو بالکل اندھیرا ہو جاتا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ صبح چڑیوں کی آوازیں اور سورج کی کرنیں اسے جگائیں گی۔ ہلکی ہلکی ہوا ایسے بہے گی جیسے کوئی گیت بڑے مدھم سروں میں سو رہا ہو۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ ناشتہ کرنے بیٹھے گا تو اُس کی چچا زاد بہن آکر ناشتہ چُنے گی

وہ کچھ دیر لیٹا ہو گا کہ اسے گھٹن ہونے لگی۔ قمیص وہ پہلے ہی اُتار چکا تھا۔ بنیان بھی اُتار دیا لیکن گرمی کا احساس کم نہیں ہوا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ تو چاروں طرف سے بند ہے۔ جیسے قید میں۔ اُس نے اس خیال کو دور کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ اُس نے دروازے کے پٹ کھول دیے پھر بھی نہ جانے کیوں بے چینی سی محسوس ہوتی رہی مکمل سکوت تھا۔ نہ موٹروں کی آوازیں تھیں نہ راہ گیروں کے چلنے کی اور نہ اُن کے باتیں کرنے کی۔ سکوت ایک بڑی ڈراؤنی سی آواز میں تبدیل ہو گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ دل کی دھڑکن دھیمی ہوئی تو وہ پھر لیٹ گیا۔ لیکن اب اسے ایسا لگنے لگا جیسے چھت اور دیواریں اس پر گری پڑ رہی ہوں۔ آخر وہ اُٹھا، بستر لپیٹ کر باہر آیا اور فٹ پاتھ پر بچھا کر سو گیا۔

٭

خوشی کا درد

اُس نے مڑ کر دیکھنا چاہا کہ واقعی کوئی اُس کے پیچھے کھڑا ہے یا روز کی طرح صرف اس کا وہم ہے۔ لیکن اُس کے سر پر کسی چیز کی ضرب لگی اور وہ چکرا کر گر پڑا۔
پتہ نہیں کتنی دیر بعد اُسے ہوش آیا۔ اُس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کچھ کوشش کر کے وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھول پایا۔ وہ اپنے کمرے ہی میں تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی سامان سمیٹ رہا ہے۔ اُسے آہستہ آہستہ پورا واقعہ یاد آیا۔ اُس کا وہم سچ ہو گیا تھا۔ شدید درد کے باوجود اس نے سکون محسوس کیا۔ اب وہ اس بھیانک خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ جو ہر رات سونے سے پہلے اسے اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ ہر رات بستر پر لیٹے لیٹے اسے محسوس ہوتا کہ چور، دروازہ کھول کر یا کھڑکی سے داخل ہو رہا ہے۔ وہ بار بار مڑ کر دیکھتا، کبھی دروازے تک جا کر دیکھتا کہ اس نے ٹھیک سے بند کیا ہے یا نہیں۔
لیٹے لیٹے وہ چور کو سامان ایک بڑے تھیلے میں ڈالتے دیکھنے لگا۔ اچھی خاصی جسامت تھی۔ ایسے اطمینان اور خوشی سے سامان جمع کر رہا تھا کہ اسے رشک آنے لگا۔ سر کا درد کم ہو گیا تھا تو بالکل اسی طرح ہو گیا۔ جیسے وہ سوچتا آیا تھا۔ اُس نے اطمینان سے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ دیر اسی طرح

خالی الذہن لیٹا رہا ہوگا کہ اُسے پیروں کی چاپ اپنے قریب آتی سنائی دی۔ وہ اُسی کی طرف آرہا ہے۔ اُس نے سوچا۔ وہ چپ چاپ ساکت لیٹا رہا۔ چور اُس کے قریب آکر رُک گیا۔ اُس کا جی چاہا، آنکھیں کھول دے۔ اُس نے اپنی اِس خواہش کو شدّت سے دبا دیا۔ چور ایک منٹ تک ہی کھڑا رہا ہوگا۔ لیکن یہ ایک منٹ کا وقفہ بھی اسے بہت طویل معلوم ہوا۔ پیروں کی چاپ آہستہ آہستہ دور ہونے لگی۔ وہ جا رہا ہے۔ اُس نے سوچا۔ چاپ تھم گئی۔ شاید وہ دروازے پر رُک گیا ہے اور مُڑ کر اُسے دیکھ رہا ہے۔ ایک لمحہ بعد پیروں کی چاپ پھر سنائی دینے لگی اور کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔ وہ چلا گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ جا چکا تھا۔ لیکن وہ اُٹھا نہیں۔ بڑی دیر تک اُسی طرح لیٹا رہا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ سر میں اب بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا لیکن اس کا موڈ بہت اچھا ہوگیا تھا۔ رہ رہ کر اُسے خیال آتا کہ بالکل اسی طرح سب کچھ ہوا جس طرح وہ سوچا کرتا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر تک وہ اسی طرح لیٹا رہا۔ جب لیٹے لیٹے کچھ اُکتا گیا تو اُس نے سوچا اب اُٹھ جانا چاہیے۔ لیکن بجا کیا ہے۔؟ گھڑی بھی چور لے جا چکا تھا۔ نیچے کے ہوٹل کے دروازے کھلنے کی آواز آئی۔ پانچ سوا پانچ ہو رہے ہیں۔ اُس نے سوچا۔ وہ اُٹھا اور کپڑے اُتار کر نل کے نیچے بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک نہاتا رہا۔ نہا کر اُٹھا اور تولیہ سے بدن پونچھ کر کپڑے تبدیل کیے۔ گرم کپڑے اور ٹیریلین کی قمیص چور لے گیا تھا۔ اس نے سوتی قمیص اور پتلون پہنی اور تکیہ کے غلاف میں سے بٹوا نکالا۔ اُسے بٹوا اس طرح چھپا کر رکھنے کی احتیاط پر بڑی خوشی ہوئی۔ کچھ کچھ اُجالا ہونے لگا تھا۔ اُس نے جوتے پہنے اور کمرہ بند کر کے اُتر گیا۔

ایرانی کے ریستوران میں وہ عادت کے مطابق دروازے کے قریب کی میز پر بیٹھا۔ ہمیشہ کی طرح اُس نے چائے کا آرڈر دیا۔ پھر اپنی کنجوسی پر پشیمان ہوکر بیرے کو واپس بلایا اور مسکہ سلائس، انڈا تلا ہوا اور چائے منگوائی۔ آج وہ پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اُس کے ہاتھ ہمیشہ کی طرح جیب میں گئے

کہ پیسے ہیں یا نہیں۔ لیکن اُس نے ہاتھ جیب سے باہر نکال لیے۔ ناشتہ کرکے معمول کے مطابق اپنے کمرے میں جانا اُسے ٹھیک نہیں لگا۔ وہ پیسے ادا کرکے باہر آیا اور راستوں پر ٹہلنے لگا۔ وہی لوگ اکا دُکا راستے پر نظر آرہے تھے جنھیں ملازمت کے لیے علی الصبح نکلنا پڑتا ہے۔ سردی خاصی تھی لیکن قابلِ برداشت۔ بس اسٹاپ پر پہنچا تو خیال آیا کہ کیوں نہ اپولو بندر چلا جائے۔ وہ بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد بس آ گئی۔ وہ اوپر کے ڈیک پر چلا گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے ڈرائیور بڑی تیزی سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ ہوا لگنے سے اُس کے بال اُڑے۔ اُس نے ہاتھوں سے بال سنوارنے کی کوشش کی۔ ہاتھ لگتے ہی ہلکے سے درد کا احساس ہوا اور رات کا واقعہ پھر اُس کے ذہن میں گھوم گیا۔ وہ اپنی توجہ ہٹانے کے لیے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

اپولو بندر پہنچے تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ وہ چلتے چلتے سمندر کے کنارے بنی منڈیر پر ایک جگہ چھاؤں دیکھ کر بیٹھ گیا۔ خالی الذہن وہ آس پاس کا ماحول دیکھتا رہا۔ اُس کے قریب ایک شخص سیٹھا ٹرانزسٹر پر فلمی گانے سُن رہا تھا۔ دو بوڑھے بات چیت میں مشغول تھے۔ ایک ملازم لڑکا اپنے آقا کے کُتے کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ایک کمسن لڑکی سائیکل چلا رہی تھی۔ دو غیر ملکی سمندر کی طرف منہ کیے کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ اُس نے مسرت سے سانس لی۔ آس پاس کا منظر صبح کی ہوا کے ساتھ ساتھ اُس کی رگ رگ میں پیوست ہو رہا تھا۔ مسرت سے اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ خوشی اب تک کہاں تھی۔ کیا خوشی اسی کو کہتے ہیں۔ خوشی کو ضبط کرنے کی کوشش میں وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے سمندر کی منڈیر کے ساتھ ساتھ وہ بڑی دور تک چلا گیا۔ قریب کی ایک گلی میں ایک جدید طرز کا ریستوران تھا۔ وہ چائے پینے کے لیے وہاں چلا گیا۔ ایک میز پر بیٹھ کر اُس نے بڑی خود اعتمادی سے چائے کا آرڈر دیا اور ہوٹل کے ملازمین کو غور سے دیکھنے لگا۔ چائے پیتے ہوئے اُسے خیال آیا کہ اُسے آفس جانا ہے۔ لیکن آج آفس جانے کے لیے اُس کا جی نہ چاہا۔ لیکن پھر کہاں جائے۔ بہر حال آج وہ آفس نہیں جائے گا۔ اُسے یہ روزگا

چکّر توڑتے ہوئے خوشی ہوئی۔ کیوں نہ کوئی فلم دیکھی جائے۔ اُس نے بیرے سے اخبار منگوا کر دیکھا۔ صرف ہندی فلموں کے صبح کے شو تھے۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اُس نے کھیل کا صفحہ دیکھا۔ موہن بگان فائنل کھیل رہی تھی۔ فٹ بال کھیلے اور دیکھے ہوئے اُسے ایک زمانہ ہو گیا۔ اُس نے طے کیا کہ شام کو وہ میچ دیکھنے ضرور جائے گا۔

سنیما ہاؤس پر بڑی بھیڑ تھی۔ زیادہ تر طالب علم تھے۔ اُسے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آیا۔ وہ بھی اسی طرح اسکول سے بھاگ کر فلمیں دیکھنے آیا کرتا تھا۔ وہ بکنگ آفس پر لگی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ طالب علم یہاں وہاں دوڑ رہے تھے۔ لڑکیوں کے بھی غول کے غول تھے۔ قہقہے وقفے وقفے سے فضا میں بکھر جاتے۔ قطار آہستہ آہستہ سرکتی رہی۔ اس کا نمبر آنے تک شو کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ ٹکٹ خرید کر ہال کی طرف دوڑا۔ سیٹ بہت آگے ملی تھی۔ ایر کنڈیشنڈ ہال میں اُس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُسے خیال آیا کہ لوگ ابھی آفس میں آ رہے ہوں گے اور دستخط کرتے ہی ساڑھے پانچ بجے تک کے لیے قید ہو جائیں گے۔ میں آزاد ہوں۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ اور مسکراتے ہوئے پیر پھیلا دیے اور سر کو سیٹ سے لگا دیا۔

فلم مزاحیہ تھی اور دیکھی ہوئی۔ لیکن چونکہ دیکھے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ بہت سی باتوں کو وہ بالکل بھول گیا تھا۔ صرف کچھ مناظر اُسے یاد تھے۔ وہ فلم میں خوب ہنسا۔ ایسی بے فکری سے جیسے وہ ابھی طالب علم ہی ہو۔ دو بار تو سیٹی بجانے کا ارادہ کر کے رہ گیا۔

سنیما دیکھ کر نکلا تو بھوک خاصی لگی ہوئی تھی۔ قریب کے ایک اچھے سے ہوٹل میں گیا اور بھاجی اور مرغ کا آرڈر دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے اسے ایسا لطف آیا جیسا اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ زندگی اسی کو کہتے ہیں۔ کوکا کولا کی ایک چسکی لیتے ہوئے اُس نے سوچا۔ اُس کی میز پر دو آدمی بیٹھے ہوئے فائنل کھیل پر تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ عجلت سے اُٹھا اور باہر آ کر ٹیکسی کی۔ کھیل اگرچہ چار بجے شروع ہونے والا تھا لیکن اچھی جگہ حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلدی پہنچتا۔ تین بجے ٹکٹیں فروخت ہونے لگیں اور اسے اپنی پسند کے مطابق جگہ مل گئی۔ تھوڑی دیر میں اسٹیڈیم میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ اُس نے اپنے کچھ پرانے ساتھیوں کو جگہ

تلاش کرنے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے اُوپر بُلا لیا۔ وہ بہ ہزار دقت لوگوں کو پھلانگتے اُن کی گالیاں کھاتے اُوپر آئے۔ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو سمجھا بجھا کر اُس نے تھوڑا تھوڑا سکڑ کر بیٹھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح اپنے دوستوں کے لیے جگہ بنالی۔ وہ آپس میں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ ایک دوسرے کی خیر خیریت پوچھی گئی۔ کھیل شروع ہوا۔ موہن بگان کے پیچھے پیچھے اُس کا کھلاڑی کھنے لگا اور جب ٹیم نے گول کیا تو اُس نے میدان سر پر اُٹھا لیا۔ کھیل ختم ہونے تک وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر چکا تھا۔

دوستوں میں سے کسی نے تجویز پیش کی کہ بہت دنوں بعد ملے ہیں کیوں نہ رات کا کھانا اکٹھے کھایا جائے۔ تجویز فوراً منظور کر لی گئی۔ انھوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ بیتی باتیں یاد کر کے خوب لطف اندوز ہوئے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق ہونے لگا اور بات دھول دھپے تک جا پہنچی۔

گھر پہنچ کر بغیر کپڑے اُتارے وہ بستر میں لیٹ گیا اور دن بھر کے واقعات ذہن میں دُہرانے لگا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ اُسے نیند نہیں آئی۔ رات کے گیارہ بجے، بارہ بجے۔ شاید خوشی کی وجہ سے اُسے نیند نہیں آ رہی ہے۔ اُس نے سوچا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے ایک بج گیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اُس نے اپنا خوف یاد کرنے کی کوشش کی جسے سوچتے سوچتے وہ سو یا کرتا تھا۔ لیکن اب خوف ختم ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑے کھڑے اُکتا گیا تو پھر بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن نیند کا پتہ نہ تھا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی۔ رات بھر جاگنے سے اُس کا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا اور سر میں شدید درد۔ اتنا شدید کہ اُس کا جی چاہا اپنا سر دیوار سے دے مارے۔

⭑

شرافت

وڈھل نے چاقو پر سے خون صاف کیا اور موڑ کر اُسے جیب میں رکھ لیا۔ اُس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ لاش کو گھورتا رہا۔ اُسے غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ پھر پلٹا اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اُتر گیا۔ اُس کے جانے کے بعد بھی جانکی بائی اور اُس کے سازندے کچھ دیر تک ایسے بیٹھے رہ گئے جیسے اُن کے ذہن ماؤف ہو چکے ہوں۔ پھر جیسے یکا یک سب ہوش میں آئے۔ جانکی خوف زدہ تھی۔ لیکن اس کو خیال آیا کہ پولیس کو بلوا لینا چاہیے۔ اُس نے اپنے سازندوں میں سے ایک کو پولیس اسٹیشن بھیجا۔ سرد بے جان لاش کو دیکھ کر اُس کے بدن میں کانٹے سے بھر گئے۔ اس کا سانولا چہرہ بالکل سیاہ ہو گیا۔ مارے خوف کے وہ رونے لگی۔

قتل کی خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ بلڈنگ بھر میں اور آس پاس کی بلڈنگوں میں بھی گانا بند ہو گیا۔ لوگ تیزی سے گلی سے نکلنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں سناٹا ہو گیا۔ گلی کافی لمبی تھی۔ وڈھل آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا۔ ہر بلڈنگ کی کھڑکی سے آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ زینوں پر، دکانوں میں لوگ کھڑے ہوئے تھے تاکہ اُسے ایک نظر دیکھ لیں۔ جو اکا دکا لوگ چل رہے تھے وہ تجسس سے پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگتے۔ وڈھل کا دماغ سُن ہو گیا تھا۔ اس

سے پہلے بھی اُس نے کئی قتل کئے تھے لیکن وہ گلیوں سے ہمیشہ فاتحانہ اور للکارتا ہوا گزرا تھا۔ لیکن آج وہ بالکل آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ جیسے کئی دن سے جلتا رہا ہو۔ اُسے قتل کرنے کا ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا تھا۔ بالکل ٹھیک کیا تھا۔ افسوس اسے اس بات کا تھا۔ کہ مرنے والا اس کا بھائی تھا۔۔ اس نے بھائی ہو کر اتنا نہیں سوچا کہ میں جانکی کے پاس جاتا ہوں۔ اور میں صبح سے کونڈا جی کو ڈھونڈ رہا ہوں کہ اُس نے برسوں میرے بھائی کو پٹیا کیوں تھا!"

شراب کی دوکان دیکھ کر وہ رُک گیا۔ دوکان پہلے ہی خالی ہو چکی تھی۔ صرف دوکان دار بیٹھا تھا۔ وٹھل کو دیکھ کر دوکان دار نے فوراً دیسی شراب کا ایک گلاس اس کو لاکر دیا۔ وٹھل نے ایک ہی سانس میں پورا خالی کر دیا۔ دُور سائرن کی آواز سنائی دی۔

"کیا میں خود ہی پولیس کے پاس چلا جاؤں؟" اس نے سوچا۔ "لیکن پھر پولیس کس لیے ہے۔" وہ اطمینان سے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کو حرکت میں آنے کے لیے ابھی وقت لگے گا۔ بیانات لیے جائیں گے۔ دوسری ضروری کارروائیاں مکمل کرنے کے بعد ہی اُس کی تلاش شروع ہوگی۔

کچھ دن سے وہ میلہ دیکھنے کی سوچ رہا تھا۔ جو شہر میں لگا ہوا تھا۔ اب اس نے سوچا۔ کیوں نہ جیل جانے سے پہلے میلہ دیکھ لیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی سب باتیں بھول کر وہ سیٹی بجاتے ہوئے چلنے لگا۔ اور میلے میں جا پہنچا۔ وہاں بہت بھیڑ تھی بے شمار دوکانیں لگی تھیں۔ ہنڈولے گھوم رہے تھے۔ وہ خوشی میں گانے لگا۔ وہ گاتے گاتے چل رہا تھا کہ بھیل پوری کی دوکان دیکھ کر رُک گیا۔ بھیل پوری کھا کر وہ بغیر پیسے دیے بڑھ گیا۔ بھیل پوری والے نے اسے تیز نظروں سے ایک بار دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ شرابی آدمی کو چھیڑ کر وہ اپنا دھندا خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی طرح وہ آئس کریم اور دوسری چیزیں کھاتا پھرا اور گھومتا رہا۔ پھر وہ ہنڈولے کے پاس پہنچا۔ کچھ دیر وہ کھڑا رہا۔ ہنڈولا رُکا تو وہ اس میں

بیٹھ گیا۔ جب ہنڈولا اونچائی پر جاتا تو وہ خوشی سے ہاتھ ہلاتا۔ منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالتا۔ نیچے آتا تو وہ زمین چھونے کی کوشش کرتا۔ ہنڈولا رکنے پر وہ اتر گیا اور پھر میلے میں گھومنے لگا۔ ایک جگہ وزن کرنے کی مشین لگی ہوئی تھی۔ پاس کھڑا آدمی چلا رہا تھا۔ "اپنا وزن معلوم کر لیجیے اور ساتھ ہی اپنی قسمت بھی! —— "او سونے والے جاگ ذرا تقدیر بدلنے والی ہے۔" وزن کرنے والے سے ہی پیسے لے کر اس نے مشین میں ڈالے۔ وزن کا ٹکٹ لے کر پاس سے گزرتے ایک آدمی سے پوچھا۔ "کیا لکھا ہے اس پر؟" اس آدمی نے ٹھٹک کر اسے ایک لمحے کے لیے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر پڑھ کر سنایا۔ "ایک سو باسٹھ پونڈ" اور ٹکٹ لوٹانے لگا۔

"قسمت۔" دھنّو نے پوچھا۔

"قسمت بھی؟" اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ٹکٹ دیکھ کر پڑھنے لگا۔ "جلد ہی کامیابی ہونے والی ہے۔ مگر خبردار غرور نہ آنے پائے۔"

دھنّو خوش ہو کر ہنسنے لگا اور آگے بڑھ گیا۔ ایک کپڑوں کی دوکان دیکھ کر اس نے سوچا، جانکی کے لیے ساڑی لے لینا چاہیے ورنہ کہے گی کہ میرے لیے میلہ سے کچھ نہیں لایا۔ جانکی ..... جانکی ..... اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ وہ یاد کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے یاد آیا کہ جانکی کے گھر پر وہ اپنے بھائی کو قتل کر کے آیا ہے۔ —— "اس سالی کے لیے میں نے اپنے بھائی کو مار ڈالا! اس کے لیے ساڑی کیوں لوں۔" لیکن جانکی اسے کیسے منع کر سکتی تھی۔ میرے بھائی کی غلطی تھی۔ وہ وہاں گیا ہی کیوں، جبکہ اسے معلوم تھا کہ میں وہاں جاتا ہوں۔ جانکی بہت اچھی ہے۔" اس نے دوکان سے ایک سرخ ساڑی لی۔ نشہ اکھڑ سا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جانکی ساڑی دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔

سڑک پار کرتے ہوئے دھنّو نے دیکھا۔ سامنے سے گونڈا جی آ رہا تھا۔ دو دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کچھ گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ وہ رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ بھائی کو تو وہ مار چکا ہے پھر اسے مارنے کی کیا ضرورت ——

"لیکن میرے بھائی کو کوئی پیٹے اور میں چھوڑ دوں ؟ دنیا کیا کہے گی ؟" غصہ سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ گاڑیاں گزر چکی تھیں۔ وہ تیزی سے کونڈاجی کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ہلکے ہلکے پیے ہوئے تھا۔ کونڈاجی اُسے دیکھ کر بھاگنا چاہ رہا تھا کہ ڈھِل نے اُس پر پے در پے وار کیے۔ وہ گر پڑا اور اس کے ساتھی بھاگ گئے۔

اب ڈھِل کا دماغ ہلکا ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے وہ گلی میں داخل ہوا۔ پیچھے سے ایک وائرلیس گاڑی آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گاڑی کی روشنیوں نے اس کی آنکھوں کو چوندھیا دیا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اُس نے دیکھا۔ کچھ پولیس والے ایک سب انسپکٹر کے ساتھ اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب وہ کیا کرے ؟ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ لمحہ بھر میں پکڑ لیا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔

"آخر شرافت بھی تو کوئی چیز ہے" "میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یہی کرتا۔" ڈھِل نے گاڑی میں پاس بیٹھے ہوئے حولدار سے کہا "کیوں حولدار ؟"

خوف زدہ حولدار نے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور سر باہر دیکھنے لگا کہ پولیس اسٹیشن کتنی دور ہے۔

ڈھِل نے سکون سے پیر پھیلا دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔

دانش میاں

صبح اخبار کی شاہ سرخی پڑھ کر مجھے تسکین کا احساس ہوا۔ لکھا تھا کہ کولابہ کے ایک فلیٹ میں ہونے والے چاروں بے رحمانہ قتلوں کا ملزم گرفتار۔ دس روز پہلے کولابہ کی ایک بلڈنگ میں رہنے والے ایک فلیٹ کے ستر سالہ بوڑھے، اس کی ضعیف بیوی، دس سالہ بچہ اور چالیس سالہ ملازم کا قتل ہو گیا تھا۔ شہر بھر میں اس واقعہ سے غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن مجرم بہت ہوشیار تھا۔ اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا اور نہ بمبئی کی پولیس ایسے معاملات میں بڑی سرعت سے کام کرتی ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس رپورٹ کے مطابق گھر سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ پھر آخر جرم کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ بہر حال اب تو مجرم پکڑا جا چکا ہے۔ مجھے تسلی ہوئی۔ جیسے میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو چکا ہوں۔ کبھی کبھی ایسے واقعات پر آدمی نہ جانے کیوں سمجھنے لگتا ہے کہ ایسے کاموں کا بدلہ لینا یا مجرم کی نشان دہی کرنا اور اس کو سزا دلوانا اس کا اپنا بھی فرض ہے۔ میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال اب تو مجرم پکڑا گیا ہے۔ مجھے تسلی ہوئی۔

میں خبر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا ''کل شام ملزم کو انسپکٹر بلبو نے کولابہ میں

ہونے والے چار بے رحمانہ قتلوں کا الزام میں گرفتار کرلیا۔ بتایا جاتا ہے کہ دانش میاں نے اقبال جرم کرلیا ہے۔"

دانش میاں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دانش میاں اتنے بھیانک جرم کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیوں نہیں ہو سکتے؟ ہاں کیوں نہیں ہو سکتے؟

دانش میاں سے میری ملاقات کالج کی لائبریری میں ہوئی تھی۔ وہ بی۔ اے کے آخری سال میں تھے اور میں اُن سے ایک سال پیچھے۔ ہم دونوں ادب کے طالب علم تھے۔ انھیں بھی ناولوں سے دلچسپی تھی اور مجھے بھی۔ ہم اکثر مختلف مصنّفوں پر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کیا کرتے۔ ایک بار پندرہ بیس دن نظر نہیں آئے۔ اور جب دکھائی دیے تو میں نے اُن کے ہاتھ میں پریشان ہونا چھوڑیے۔ جینا شروع کیجیے، خود اعتمادی، کامیاب زندگی وغیرہ کتابیں دیکھیں۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کی دلچسپی ناولوں سے کم ہوگئی ہے۔" میں نے پوچھا۔
"کم نہیں ہوئی، ختم ہوگئی۔" انھوں نے کہا۔
"کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"ناول پڑھنے کو اب جی نہیں چاہتا۔" انھوں نے کہا۔ "اُکتا گیا ہوں۔"
چند مہینوں بعد میں نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھوں میں مذہبیات سے متعلق کتابیں ہیں۔

"آپ کی توجہ غالباً آج کل مذہبیات کی طرف ہے؟" میں نے پوچھا۔
"جی ہاں زندگی سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کے لیے اور زندگی کو سمجھنے کے لیے مذہب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔" اُنھوں نے بتایا۔
"اگر آپ کے پاس ہوں تو مجھے بھی خود اعتمادی، پریشان ہونا چھوڑیے، جینا شروع کیجیے وغیرہ کتابوں میں سے کوئی کتاب دیجیے۔" میں نے گزارش کی۔

" جانے دیجیے سلیم صاحب! انتہائی بکواس کتابیں ہیں۔ انتہائی بیزار کن اُکتا جائیں گے آپ۔"

میں نے انھیں تعجب سے دیکھا۔ دُبلا پتلا، پونے چھ فٹ کا جسم۔ وزن بہ مشکل سو پونڈ ہوگا۔ خدوخال مکمل ہوتے ہوئے بھی ادھورے لگتے تھے۔ پہلی مرتبہ میں نے انھیں غور سے دیکھا۔

دو چار مہینے بعد ایک نکڑ پر مل گئے۔ خیروعافیت پوچھنے کے بعد میں نے کہا۔

" آیئے، اتنے دنوں بعد ملے ہیں۔ ایک کپ چائے پی لیں۔"

ہم دونوں ہوٹل میں جا کر بیٹھے۔ حسبِ معمول دو چار کتابیں اُن کے پاس تھیں۔ میں یوں ہی اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ تصوّف، تصوّف کی حقیقت تصوف کی تاریخ وغیرہ۔

" یہ آپ تصوف کی طرف کیسے متوجہ ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔

" مذہب کی صحیح تعبیر تصوّف کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ دورِ جدید جس ابتلا دمشکل میں ہے اس سے صرف اسی کے سہارے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ اب آپ ہی دیکھیے ہپی ازم، اینگری ینگ مین وغیرہ یہ سب کیا ہے۔ یہ انتہائی مادیّت زدہ سماج کا ردّ عمل ہے۔ اگر دنیا نے ایشیا کی تعلیمات کو نہیں اپنایا تو ایک نہ ایک دن دنیا کا تباہ ہو جانا یقینی ہے۔" دانش میاں نے لکچر پلایا۔

" مذہب سے بے پروائی پر کبھی کبھی بہت پشیمانی ہوتی ہے۔" میں نے کہا "جی چاہتا ہے، خدا نے تھوڑی بہت سمجھ دی ہے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق دیا ہے تو کچھ مذہب کے متعلق بھی جاننا ضروری ہے بلکہ دراصل پڑھنے کی چیز تو وہی ہے۔ آپ نے جو کتابیں پڑھی ہیں اُن میں سے آپ کون سی کتابیں پڑھنے کی رائے دیں گے۔"

" چھوڑیے سلیم صاحب! اِن کتابوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" انھوں نے

کہا "میں تو ان کتابوں سے اُکتا گیا ہوں۔"
واقعی دانش میاں مجسم اُکتاہٹ تھے۔ انھیں دیکھ کر ہی لوگوں کو اختلاج ہونے لگتا تھا۔ ان کا چہرہ سائن بورڈ لگتا تھا جس پر لکھا ہو "میں بیزار ہوں۔"
چند دنوں بعد میری پھر ان سے ملاقات ہوئی تو حضرت یوگ اور زین پر کتابیں پڑھ رہے تھے۔
"میں سوچ رہا ہوں یوگ اور زین میں سے کون سا طرزِ زندگی بہتر ہے؟"
علیک سلیک کے بعد انھوں نے گفتگو شروع کی۔
میں نے بہانہ کیا کہ مجھے ضروری کام سے ایک جگہ جانا ہے۔ اور کھسک گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب ان حضرت سے کبھی نہ ملوں گا۔ انھیں دیکھکر نظر بچا کر نکل جاؤں گا یا راستہ ہی بدل دوں گا۔ لیکن چند دنوں بعد راستے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں کتابیں نہیں تھیں۔ مجھے اس قدر تعجب ہوا کہ میں نے ان سے نہ ملنے کا اپنا ارادہ ترک کر کے فوراً آواز دی۔
"آج آپ کے ہاتھوں میں کوئی کتاب نہیں۔؟"
وہ مُسکرائے پھر کھل کھلا کر ہنسنے لگے اور بولے۔
"شاید آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو کہ میں نے اپنی تمام کتابیں ردّی میں بیچ ڈالی ہیں۔"
"واقعی۔"؟ میں نے واقعی حیرت سے پوچھا۔
"جی ہاں۔"
"لیکن کیوں؟"
"کتابیں، کتابیں۔ کیا حاصل ہوتا ہے اِن سے؟ بس الفاظ چاٹتے رہو۔" انھوں نے کہا۔
"پھر اب کیا کرتے ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔
"کیا کرتا ہوں؟" وہ ہنسے اور پتلون کی پچھلی جیب سے ایک مختصر

کتاب نکالی۔

"آج کل یہ پڑھتا ہوں۔" اُنھوں نے کہا۔

"یہ تو ریس بک ہے۔"

"جی ہاں" انھوں نے کہا: "زندگی نام ہے عمل کا اور میں سوچ چکا ہوں کہ زندگی کے ایک ایک لمحہ سے لطف اٹھاؤں گا۔"

پھر تو دانش میاں ایسے لوگوں میں نظر آنے لگے کہ کیا کہیے۔ کبھی کسی منٹ پاتھ پر بیٹھے کسی حالی موالی سے، کبھی کسی ہوٹل میں دو تین آدمیوں کے ساتھ جے اگلے ہفتے ہونے والی ریس کے گھوڑے نکال رہے ہیں۔ میں نے انھیں سٹہ کھیلتے بھی دیکھا۔ ایک دو بار حضرت نشے میں دھت بھی نظر آئے۔ حد ہو گئی۔ سٹہ کی بٹینگ بھی لینے لگے۔ میں نے ایک دن انھیں ٹوکا۔

"جناب یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

"زندگی کا لطف اُٹھا رہا ہوں۔" دانش میاں نے کہا۔ "یہ زندگی ہے میاں زندگی۔"

اور اب تو دانش میاں نے چار آدمیوں کا قتل ہی کر دیا۔ میں نے سوچا ملنا چاہیے بہ ہزار دقت مہینے بھر بعد میں ان سے مل سکا۔

"مجھے سخت افسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سب ہو گیا۔

"افسوس کی کیا بات ہے؟" انھوں نے کہا۔

"آپ کو افسوس نہیں ہوتا۔" میں نے پوچھا "کہ آپ نے خواہ مخواہ چار آدمیوں کی جان لے لی۔"

"جان لینے پر تو کیا افسوس ہوتا" دانش میاں نے کہا "مر گئے قصہ پاک ہو گیا۔ اس میں افسوس کی کیا بات۔"

میں نے حیرت، نفرت اور غصے سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ سلاخوں کو دیکھ رہے تھے۔

"افسوس تو اس بات کا ہے۔" انھوں نے کہا "اس تجربے میں بھی کوئی مزہ

نہیں آیا۔"

میں چلا آیا۔ کچھ عرصے بعد مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ ماتحت عدالت سے کیس عدالت بالا میں پہنچا۔ پھانسی کی سزا ہوئی۔ مقدمہ کے دوران میں کسی روز عدالت نہیں گیا۔ اخبار میں کارروائی پڑھتا رہا۔ لیکن پھانسی کے موقع پر نہ جانے کیوں جیل چلا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے کر میں پہنچا۔ دانش میاں کو لایا گیا۔ میں نے ان کے چہرے کی کیفیات ٹٹولنے کی کوشش کی ذہنی بیزاری کا سائن بورڈ ان کا چہرہ بنا ہوا تھا۔

دانش میاں کو پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ان کو کانوں سے نیچے تک ٹوپی پہنا دی گئی۔ پھندا گردن میں ڈال دیا گیا۔

دانش میاں کیا سوچ رہے ہوں گے؟

مجسٹریٹ نے اشارہ کیا۔ پھندا تنگ کر دیا گیا۔ جسم میں کچھ لمحے اینٹھن ہوئی اور پھر ساکت ہو گیا۔ میں کانپ گیا۔

"یہ تجربہ کیسا رہا دانش میاں؟" میں نے دل ہی دل میں ان سے پوچھا۔
اچانک ان کے چہرے پر ڈھکی ٹوپی کچھ ہلی۔ شاید دانش میاں کہہ رہے تھے۔
"انتہائی بیزار کن، جناب! کچھ مزا نہیں آیا۔ بالکل بے لطف۔"

بال و پر

سورج جاتے جاتے آسمان پر سرخی کے چھینٹے دیتا گیا تھا۔ سرخ، سیاہ بادل مل جل کر عجیب نقشے بنا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ورانڈے سے کچھ دُور دو چار درخت تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے اطراف کی ہر شے کو ساکن کر رہے ہیں۔ دیپک رائے ورانڈے میں آرام کرسی ڈال کر بیٹھے تھے۔ انھوں نے ماحول کی طرف توجہ نہیں دی وہ بیزار تھے، جینے کا جیسے چاؤ ہی ختم ہو گیا تھا۔ تمام عمر کے تجربات، مطالعہ اور فکر کا یہی حاصل ہوگا۔ یہ تو انھوں نے نہیں سوچا تھا۔ ہر چیز ایسی فرسودہ معلوم ہوتی تھی۔ وقت کا لمحہ لمحہ ریت کا ذرّہ تھا جو اُن کے وجود میں سرایت کر کے اُسے تلخ اور بھاری بنا رہا تھا۔

"بابوجی، کیوں ہر وقت چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں؟" گیارہ سالہ گوتم نے اپنی ماں مالتی سے پوچھا۔

مالتی نے پیاز چھیلتے ہوئے ایک نظر بابوجی پر ڈالی۔

"میں کیا جانوں، اپنے بابوجی ہی سے پوچھو۔" اُس نے کہا۔

وہ دوبارہ پیاز چھیلنے میں مصروف ہو گئی۔ لیکن ذہن دیپک رائے کے بارے

میں سوچنے لگا۔ مردوں کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے۔ انھوں نے سوچا بیٹھے ہیں تو بیٹھے ہیں پھر کچھ من میں سما گئی تو سب کچھ بھول کر اسی میں مگن ہو گئے۔ ایک زمانہ تھا بیٹھے اور آفس کی فائلیں، پھر ریس کا شوق چرایا تو دن رات گھوڑوں کی نسلیں دیکھتے گزرنے لگے۔ اس کے بعد پڑھنے کی دھن سمائی تو ایسی کہ عینک کے نمبر تیزی سے بدلنے لگے۔ اب کتابوں کو دیمک چاٹ رہی ہے اور آپ چپ چاپ ورانڈے میں بیٹھے رہتے ہیں۔

"بابوجی! بابوجی!" کسم کی آواز سن کر دیپک رائے نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے نیچے کھڑی اسے پکار رہی تھی۔

"بابوجی، ادھر آیئے، دیکھیے کیا ہے۔" کسم نے کہا۔

بابوجی بیٹھے رہے۔ ہر طرح کی نقل و حرکت سے وہ بیزار تھے۔ کسم نے قریب آ کر اپنے نازک ہاتھوں سے اُن کے کندھے پکڑ لیے۔

"چلیے نا بابوجی! بے چاری مینا گر پڑی ہے۔" اس نے کہا۔

بابوجی بادل ناخواستہ مینا کے قریب گئے، جو ادھ موئی ہو رہی تھی۔

"اُٹھا لو!" جذبات سے عاری لہجے میں انھوں نے کہا۔

کسم نے بہت ہی احتیاط سے مینا کو اٹھایا اور انھیں دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو اب کیا کروں؟

"اپنی ماں کو دکھاؤ۔" انھوں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

وہ مینا کو لیے احتیاط سے چلتی ہوئی ماتی کے پاس چلی گئی۔ اور دیپک رائے پھر کرسی میں دھنس گئے۔

رات کے ایک بجے ہوں گے، اُن کی آنکھ کھل گئی۔ مینا کیسی ہوگی؟ انھیں خیال آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ماتی نے تو اسے پانی پلا دیا ہوگا۔ شاید زخم بھی آئے ہوں۔ پتہ نہیں ماتی نے اسے کہاں رکھا ہے۔ وہ دوبارہ لیٹ گئے۔ لیکن بڑی دیر تک انھیں نیند نہ آئی۔

صبح آنکھ کھلتے ہی وہ کچن میں گئے جہاں ماتی رسوئی بنا رہی تھی۔ بنا منہ دھوئے

اس طرح رسوئی میں آتے دیکھا تو مالتی کو بڑی حیرت ہوئی۔

"ملینا کیسی ہے۔ اب کہاں رکھی ہے؟" دیپک رائے نے پوچھا۔

مالتی نے اشارہ سے دکھایا۔ انھوں نے دیکھا کچن کے کپ بورڈ کے اوپر ملینا کو رکھ کر اُس پر مالتی نے گیہوں چھاننے کی بڑی سی چھلنی رکھ دی تھی۔ انھوں نے چھلنی ذرا سی اُٹھائی۔ ملینا سہمی ہوئی نگاہوں سے اُنھیں دیکھ رہی تھی۔

دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔" مالتی نے کہا۔

وہ ملینا کو دیکھتے رہے۔ اُس کی گردن اور پیٹ میں ذرا سا زخم تھا انھوں نے چھلنی رکھی اور منہ دھونے چلے گئے۔

وہ ورانڈے میں بیٹھے تھے۔ کسم اُن کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے اسے دیکھا۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔

"ملینا اب اچھی ہے۔" کسم نے کہا۔

"اچھا۔۔؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ماتاجی کہتی ہیں کہ دو تین دن میں بالکل اچھی ہو جائے گی۔" کسم نے کہا۔

"اچھا۔۔؟"

"تو پھر ملینا چلی جائے گی؟"۔۔ کسم نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی!" دیپک رائے نے پیار سے اُس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔

کسم آزردہ ہو گئی۔

"ہم لوگ اُسے پال نہیں سکتے؟" کسم نے پوچھا۔

"اپنی ماتاجی سے پوچھو۔" دیپک رائے نے کہا۔

"ماتاجی نے تو آپ سے پوچھنے کے لیے کہا ہے۔" کسم نے مُنہ بنا کر کہا۔

دیپک رائے سوچنے لگے۔ اُن کا جی چاہ رہا تھا کہ مالتی ملینا کو پال لے۔ لیکن آزاد پنچھی کو پنجرے میں بند کرنے کو اُن کا دل نہیں چاہا۔

"نہیں بیٹی۔" دیپک رائے نے کہا۔ "وہ درختوں پر رہتی ہے۔ ہم اُسے کمرے میں کیسے رکھ سکتے ہیں۔؟"

"لیکن ہم اُسے پانی پلائیں گے۔ دانہ دیں گے۔" کسم نے کہا۔

"وہ تم ایسے بھی دے سکتی ہو۔ وہ روز تم سے ملنے آئے گی۔ تب تم اسے دانہ دینا اور پانی پلا دینا۔" دیپک رائے نے سمجھایا۔

"وہ واپس آئے گی؟" کسم نے شک کے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ ہماری کسم بیٹی کو وہ بھولے گی تھوڑی۔" دیپک رائے نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سوچو بیٹی دن بھر وہ گھومتی رہتی ہے۔ ایک کمرے میں پنجرے میں بند رہے گی تو اسے اچھا تھوڑے ہی لگے گا۔"

"ہاں پتاجی!" کسم کی بھی سمجھ میں بات آگئی۔

دو تین روز بعد مینا اچھی ہو گئی۔ دیپک رائے بھی نہ جانے کیوں اپنی طبیعت کچھ ہلکی محسوس کر رہے تھے۔ مالتی نے آنگن کی چھلنی کے نیچے سے مینا کو نکالا۔ کسم نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ پھر پتاجی کو دے دیا۔ دیپک رائے نے دیکھا۔ زخم اچھا ہو چکا تھا۔ لیکن نشان رہ گیا تھا۔ انھوں نے مالتی اور کسم کو مسکرا کر دیکھا۔ ہاتھ اوپر کیے اور پوچھا "اُڑا دوں۔؟" کسم نے سر کے اشارے سے "ہاں" کہا۔ دیپک رائے نے گرفت ہلکی کی۔ مینا اُڑ کر درخت پر جا بیٹھی۔ پھر ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر پھدکتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

دوسرے دن صبح اُنھوں نے دیکھا۔ کسم اُٹھ کر برآمدے میں آ بیٹھی ہے۔ وہ اسے پیار سے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد کسم اچانک اُن کی طرف مڑی اور پوچھا۔

"پتاجی! مینا آئے گی نا؟۔"

"ہاں بیٹی۔!" دیپک رائے نے جواب دیا۔ لیکن درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے سوچا۔ "کیا سچ مچ وہ آئے گی۔؟"

"پتاجی، وہ آئی، وہ آئی۔" کسم دوڑتی ہوئی اُن کی طرف آئی۔

"کہاں ہے؟" نہ جانے کیوں اُن کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔

"وہ رہی!" کسم نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"مجھے تو نظر نہیں آتی؟" اُنھوں نے عینک لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ رہی میرے ہاتھ کی سیدھ میں۔" کسم نے کھِلکھلا کر کہا۔

ایک دھبّہ پھدکتا دکھائی دیا۔

"ہاں شاید کچھ ہے تو؟" انھوں نے کہا۔

"میں پانی لاتی ہوں۔" کسم نے کہا اور کچن کی طرف دوڑ گئی۔

"کیا یہ وہی مینا ہے؟" اُنھوں نے سوچا۔ اُنھیں یاد آیا۔ اُن کی دوربین میز کی دراز میں پڑی ہے۔ کسم پانی اور چاول کے دانے لے آئی اور اُن کی آرام کرسی کے قریب رکھنے لگی۔

"بیٹی، ذرا پرے رکھو، ورنہ نہیں قریب دیکھ کر شاید نہ آئے۔" انھوں نے کہا۔

کسم نے دانہ پانی کچھ اور دور رکھ دیا۔ اور اُن کے پاس آ گئی۔

"بیٹی دیکھنا میری میز کی دراز میں دوربین رکھی ہوگی۔ ذرا لے آنا۔" انھوں نے اُس سے کہا۔ "وہ جس میں دو گول گول کانچ کی آنکھیں لگی ہیں۔ اور دیکھنا ایک کپڑا بھی لیتی آنا۔"

وہ دوڑ کر گئی اور پھرتی سے دونوں چیزیں لے آئی۔ اُنھوں نے دوربین کو صاف کیا۔ جس پر کئی سالوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے دوربین سے مینا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مینا نظر نہیں آئی۔ دو چار منٹ اسی طرح گزر گئے۔ آخر کئی شاخوں کے بیچ ایک مینا دکھائی دی۔ کیا یہ وہی مینا ہے۔ انھوں نے اُس کی گردن سے ذرا نیچے دیکھا۔ دھبّہ سا تو تھا۔

"شاید وہی ہے۔" انھوں نے کسم سے کہا اور اسے دوربین سے دکھانے لگے۔

کسم نے مینا کو دیکھتے ہی خوشی سے چلّانا شروع کیا۔ "ہماری مینا آ گئی۔ ہماری مینا آ گئی۔" کچھ دیر بعد پھدک کر مینا برانڈے کی دیوار پر آ بیٹھی۔ پھر کچھ منٹ کے بعد

دالانوں کے قریب آگئی۔ کسم مالتی کو بُلا لائی۔ دیپک رائے سوچنے لگے۔ انھیں اِس قدر خوشی کیوں ہو رہی ہے۔؟"

دوربین اب اُن کے سرھانے رہنے لگی۔ صبح اُٹھ کر وہ درختوں پر بیٹھے پرندوں دیکھتے۔ کتنے خوبصورت پرندے ہیں۔ وہ سوچتے۔ ان میں ہماری مینا کون سی ہے؟

پھر ایک دن (Bird watching) پر ایک مضمون اخبار پڑھتے ہوئے اُن کی نظر سے گزرا۔ اور اُنھوں نے کئی کتابیں اِس موضوع پر منگوالیں۔ وہ دن دن بھر پرندوں کو تکتے رہتے۔ اُنھیں پہچاننے کی کوشش کرتے۔ بڑے جوش سے کسم کو ایک ایک تفصیل بتلاتے۔ یہ کیسی خوشی ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتے۔ لیکن بس اسی طرح دن گزرتے چلے جائیں۔

ایک دن وہ کسم کو لے کر جنگل کی طرف نکل گئے اور بڑی دیر تک پرندوں کو دیکھتے رہے۔ وہاں سے لوٹے تو اُجڑا اُجڑا سا اور ننڈا اچھا نہیں لگا۔ کیوں نہ یہاں باغ لگایا جائے۔ کتنا اچھا معلوم ہوگا۔ دوسرے دن انھوں نے ایک مالی کو بلوایا اور گرم جوشی کے ساتھ اُس کے ساتھ کام میں مصروف ہو گئے۔

"مردوں کی طبیعت بھی واقعی عجیب ہوتی ہے۔" چاول پھٹکتے ہوئے مالتی نے اُنھیں کچن سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یا تو اِس قدر چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے یا اب زمین کھودنے میں لگے پڑے ہیں۔"

✪

جب بوڑھا فریم سے نکل گیا

بے شمار جھرّیوں والے بوڑھے نے نَے مُنہ سے نکالی اور دھواں سیٹھ دیوان چند کے بیخ بستہ ڈرائنگ روم میں بکھیر دیا۔ مسکراتا ہوا وہ فریم سے نکل آیا اور سرخ و سبز قالین پر قدم رکھتا گیلری سے نیچے اُتر کر اونچی اونچی عمارتوں کے بیچ سمنٹ کانکریٹ کی سڑک پر ڈگ بھرتا مختصر ہوتا ہوا ننھی لکیر اور پھر نقطہ بنا پھر تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔

دو بجے رات تک سیٹھ دیوان چند کے ڈرائنگ روم میں پارٹی ہوتی رہی تھی۔ وزیرِ اعلیٰ، کمانڈر انچیف، شہر کے معزّز صنعت کار، پولیس کمشنر، انڈر ورلڈ سلاطین، بد مست شہری ادیب اور موم ملائی مکھن سے بنی گڑیاں غیر ملکی موسیقی پر رقص کرتے اور شراب لنڈھاتے رہے تھے۔ سیٹھ دیوان چند نے آخری بار افواج کے سربراہ، معزّز صنعت کاروں، پولیس کمشنر، انڈر ورلڈ کے سلاطین کے گلاس بھرے اور آخری جام وزیرِ اعلیٰ کو پیش کیا۔ وزیرِ اعلیٰ نے ایک ارغوانی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے فریم میں بیٹھے ہوئے بیچوان گڑگڑاتے ہوئے بیشمار جھرّیوں والے بوڑھے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آخری جام اس بوڑھے کے نام" ہنستے ہوئے سب نے اپنے اپنے گلاس بوڑھے کی طرف بڑھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ اب سب اپنے اپنے بستروں پر بدمست ہو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سیٹھ دیوان چند کا نوکر ونشنو بغیر آواز کیے ہوئے ڈرائننگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ ریفریجریٹر سے وہسکی کی کئی بوتلیں نکال کر شراب گھاسلیٹ کے خالی کنستر میں اُنڈیلی

خالی بوتلیں شیلف پر رکھی دوسری خالی بوتلوں کے ساتھ رکھ کر سرخ دبیز قالین پر چلتا آہستہ آہستہ باہر چلا گیا۔

صبح سیٹھ دیوان چند اشنان کرکے پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر ڈرائنگ روم میں آئے اور یوگا ورزشیں کرنے لگے۔ اس دوران وشنو دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ کر صفائی میں مصروف ہوگیا۔ سیٹھ دیوان چند ورزش کر چکے تو صوفے پر بیٹھ کر صبح کا اخبار دیکھنے لگے پھر گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگے۔

وشنو کمرے کی دیواریں جھاڑتا فریم کے قریب پہنچا۔ فریم دیوار سے اُتاری تو اس کے پیر کپکپانے لگے۔

"سرکار!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہ۔ و۔ و۔ م؟" سرکار نے بغیر نظریں اُٹھائے پوچھا۔

"سرکار۔۔ اس میں بیٹھا بوڑھا۔" وشنو ان کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

دیوان چند نے فریم ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ نے فریم سے نیچے لٹک رہی تھی۔ دھواں آہستہ آہستہ نکل کر کمرے میں پھیل رہا تھا اور بوڑھا فریم سے غائب تھا۔ طمانیت ان کے چہرے سے بھاپ بن کر اُڑی اور فضا میں گھُل گئی۔ ان کے سر کے بال سفید ہوکر منجمد ہوگئے۔ وہ بے حد معمر، بے حد متفکر نظر آنے لگے۔ فریم صوفے پر پٹک کر وہ تیزی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھے۔ اُنھیں اپنی پھرتی پر خوشی ہوئی۔ یہ یوگا کا چمتکار ہے۔ اُنھوں نے سوچا۔ لیکن بوڑھا کہاں چلا گیا؟

اُنھوں نے ٹیلی فون کے ڈائل گھمائے اور کمشنر کو بتایا کہ ان کے ڈرائنگ روم میں لگی فریم سے نکل کر بوڑھا غائب ہوگیا ہے۔ کمشنر کے چہرے سے طمانیت بھاپ بن کر اُڑی اور فضا میں گھُل گئی۔ کمشنر کے سر کے بال سفید ہوکر منجمد ہوگئے۔ وہ بے حد معمر، بے حد متفکر نظر آنے لگے۔ انھوں نے اپنے نائب کو فوراً تمام تھانوں پر خبر کرنے کی ہدایت کی اور وزیر اعلیٰ کو ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ سیٹھ دیوان چند کے ڈرائنگ روم میں لگے فریم سے نکل کر بوڑھا فرار ہوگیا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے چہرے کا اطمینان بھاپ بن کر اُڑا اور فضا میں گھُل گیا۔ وزیر اعلیٰ کے بال برف کے مانند سفید ہوکر منجمد ہوگئے۔ وہ بے حد معمر، بے حد متفکر نظر آنے لگے۔ اُنھوں نے فوراً کمانڈر انچیف کو بلا بھیجا۔

آدھے گھنٹے بعد کمانڈر انچیف وزیر اعلیٰ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے اُنھیں بتایا کہ سیٹھ دیوان چند کے ڈرائنگ روم میں لگے فریم سے نکل کر بوڑھا فرار ہو چکا ہے۔ فوج کے سربراہ کے چہرے سے طمانیت بھاپ بن کر اُڑی اور فضا میں گھُل گئی۔ اُن کے سر کے بال برف کی مانند سفید ہو کر منجمد ہو گئے۔ وہ فوراً اپنے ہیڈ کوارٹرس کو گئے۔ افواج کو چوکس کر دیا گیا۔ طیارے فضا میں بلند ہوئے۔ جنگی جہاز سطح سمندر پر بچھ گئے۔

دن بھر شہر میں وائرلیس گاڑیاں دوڑتی رہیں۔ طیارے فضا میں منڈلاتے رہے جہازوں نے سمندر کی سطح کھنگال ڈالی۔ لیکن بوڑھا دکھائی نہیں دیا۔

اگلے روز کے اخبارات میں بوڑھے کی گم شدگی کی خبر نہیں چھپی۔ مگر سیاہ سطروں کے بیچ اس خبر کو سب نے پڑھ لیا۔ در اصل اس کا احساس انھیں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ہر شے اگرچہ پہلے جیسی ہی تھی، پھر بھی آج ہوا کچھ زیادہ خوشگوار، آسمان کچھ زیادہ نیلا، گھاس کچھ زیادہ ہری اور چائے کچھ زیادہ ذائقہ دار تھی۔

رات دو بجے وشنو ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر دبے پاؤں داخل ہوا۔ ریفریجریٹر کا دروازہ کھول کر وہسکی کی بوتل نکالی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اُس نے فریم کی طرف دیکھا۔ بوڑھا نے منہ میں دبائے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

صبح فیکٹری جاتے ہوئے سیٹھ دیوان چند نے اُسے سڑک کے نکڑ پر دیکھا۔ لیکن گاڑی جب تک وہاں پہنچی، بوڑھا غائب ہو چکا تھا۔ ایک دن یوگا کی ورزشیں کرتے ہوئے اُنھوں نے دیکھا وہ پیچوان گڑگڑاتے ہوئے جھانک رہا ہے۔ اُنھوں نے آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا۔ بوڑھا غائب تھا۔ اُنھیں بخار آ گیا۔ وہ تین ہفتے بستر سے اُٹھ نہیں پائے۔

وزیر اعلیٰ کی آنکھ ابھی لگی ہی تھی کہ اُنھیں محسوس ہوا کہ بوڑھا اُن پر جھکا مسکرا رہا ہے۔ خون ان کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔ نیند ہی میں اُن پر قلب کا پہلا دورہ پڑا۔

بے شمار لوگوں نے بوڑھے کو دیکھا۔ کبھی پولیس کے مخبر نے تھانے میں خبر پہنچائی کہ وہ قریب کے ریستوران میں چائے پی رہا ہے۔ مگر جب تک وہ پہنچیں بوڑھا غائب ہو چکا تھا۔

ایک شام ادبیرائے میں قحط زدہ علاقوں کے لیے ایک چیریٹی پروگرام میں ایک بصیرت افروز تقریر کرنے کے بعد پدم شری ادیب ایک موم ملائی مخمّلی گڑیا کے ساتھ باہر آ رہے تھے۔ کار کے قریب بوڑھے کو ہاتھ پھیلائے کھڑا دیکھ کر غش کر گئے۔

وائرلیس گاڑیاں شب و روز دوڑ رہی ہیں۔ طیّارے فضاؤں میں منڈلا رہے ہیں۔ ساحل پر بحری افواج چوکس ہیں۔ صنعت کار ہراساں ہیں۔ انڈر ورلڈ کے سلاطین پریشان اور بوڑھے کے نقشِ پا شہر کے چپّے چپّے پر بکھرے ہوئے۔ وہ شہر میں بے خطر گھوم رہا ہے۔ کبھی ایسا سُننے میں آتا ہے کہ بوڑھا گرفتار ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ پھر سیٹھ دیوان چند کے ڈرائنگ روم میں لگے فریم میں لوٹ گیا ہے۔ لیکن لوگ یقین نہیں کرتے جب تک آسمان نیلا ہے۔ گھاس ہری اور چائے ذائقہ دار۔

★

روسی ادب (حصہ اول)

مصنف: محمد مجیب

صفحات: 388

قیمت: -/99 روپے

شہیدِ جستجو (ڈاکٹر ذاکر حسین)
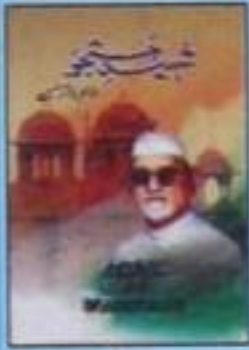
مصنف: ضیاء الحسن فاروقی

صفحات: 608

قیمت: -/175 روپے

سحر کے پہلے اور بعد

مصنف: سعید الظفر چغتائی

صفحات: 152

قیمت: -/64 روپے

تلاشِ آزاد

مصنف: عبدالقوی دسنوی

صفحات: 140

قیمت: -/60 روپے

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نمبر

مرتبہ: خلیق انجم

صفحات: 104

قیمت: -/52 روپے

تنقید کیا ہے

مصنف: آل احمد سرور

صفحات: 200

قیمت: -/62 روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج

مصنف: سید ظہور قاسم

صفحات: 48

قیمت: -/38 روپے

پطرس کے مضامین
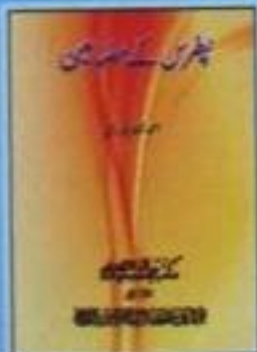
مصنف: احمد شاہ بخاری

صفحات: 156

قیمت: -/54 روپے

ISBN: 978-81-7587-958-4

₹ 68/-